باقیات ہادی

مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی

ترتیب

مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری

سلسلۂ مطبوعات (۵۰)

BAQIYAT-E-HADI

By : Maulana Abdul Hadi ul Qadri Budauni

عنوان کتاب	:	باقیات ہادی
نگارش	:	مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی
ترتیب	:	مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری
طبع اول	:	دسمبر ۲۰۰۹ء/ ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ

برائے ایصال ثواب

محترم سید احتشام احمد رزاقی و محترمہ سیدہ شمیم فاطمہ رزاقی

اورنگ آباد

Distributor	*Publisher*
Maktaba Jam-e-Noor	**Tajul Fuhool Academy**
422, Matia Mahal,	***Madrsa Alia Qadria,***
Jama Masjid,	Maulvi Mahalla,
Delhi-6	Budaun-243601 (U.P.) India
	Phone : 0091-9358563720

انتساب

میری دادی اور حضرت ہادیؔ کی والدہ

''بھابی اماں''

کے نام

جب وہ دنیا سے رُخصت ہوئیں تو ان کا ''صندلی بیٹا'' (ہادیؔ) صرف ۷/برس کا تھا۔

اسید الحق قادری

جشن زریں

یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے

مارچ ۲۰۱۰ء میں تاجدار اہل سنت حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری (زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں شریف) کے عہد سجادگی کو پچاس سال مکمل ہونے جا رہے ہیں، ان پچاس برسوں میں اپنے اکابر کے مسلک پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے رشد و ہدایت، اصلاح وارشاد، وابستگان کی دینی اور روحانی تربیت اور سلسلۂ قادریہ کے فروغ کے لیے آپ کی جد و جہد اور خدمات محتاج بیان نہیں، آپ کے عہد سجادگی میں خانقاہ قادریہ نے تبلیغی، اشاعتی اور تعمیری میدانوں میں نمایاں ترقی کی، مدرسہ قادریہ کی نشاۃ ثانیہ، کتب خانہ قادریہ کی جدید کاری، مدرسہ قادریہ اور خانقاہ قادریہ میں جدید عمارتوں کی تعمیر، یہ سب ایسی نمایاں خدمات ہیں جو خانقاہ قادریہ کی تاریخ کا ایک روشن اور تابناک باب ہیں۔

بعض وابستگان سلسلہ قادریہ نے خواہش ظاہر کی کہ اس موقع پر نہایت تزک واحتشام سے ''پچاس سالہ جشن'' منایا جائے، لیکن صاحبزادۂ گرامی قدر مولانا اسید الحق محمد عاصم قادری (ولی عہد خانقاہ قادریہ بدایوں) نے فرمایا کہ ''اس جشن کو ہم 'جشن اشاعت' کے طور پر منائیں گے۔ اس موقع پر اکابر خانوادۂ قادریہ اور علماء مدرسہ قادریہ کی پچاس کتابیں جدید آب وتاب اور موجودہ تحقیقی واشاعتی معیار کے مطابق شائع کی جائیں گی، تاکہ یہ 'پچاس سالہ جشن' یادگار بن جائے اور آستانہ قادریہ کی اشاعتی خدمات کی تاریخ میں یہ جشن ایک سنگ میل ثابت ہو''۔ لہٰذا حضور صاحب سجادہ کی اجازت وسرپرستی اور صاحبزادۂ گرامی کی نگرانی میں تاریخ ساز اشاعتی منصوبہ ترتیب دیا گیا اور اللہ کے بھروسے پر کام کا آغاز کر دیا گیا، اس اشاعتی منصوبے کے تحت گزشتہ ۲ سال سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

رب قدیر و مقتدر سے دعا ہے کہ حضرت صاحب سجادہ (آستانہ قادریہ بدایوں) کی عمر میں برکتیں عطا فرمائے، آپ کا سایہ ہم وابستگان کے سر پر تادیر قائم رکھے۔ تاج الفحول اکیڈمی کے اس اشاعتی منصوبے کو بحسن وخوبی پایہ تکمیل کو پہنچائے اور ہمیں خدمت دین کا مزید حوصلہ اور توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

عبدالقیوم قادری
جنرل سکریٹری تاج الفحول اکیڈمی
خادم خانقاہ قادریہ بدایوں شریف

فہرست مشمولات

☆ **مقالات الاموی**

☆☆☆

حرفِ آغاز

تاج الفحول اکیڈمی اپنے اشاعتی منصوبے کے چوتھے مرحلے میں خانوادۂ قادریہ بدایوں کے فرزند حضرت مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی کی متفرق شعری اور نثری نگارشات کا یہ مجموعہ اہل ذوق کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کررہی ہے۔اس سے پہلے اکیڈمی آپ کا بہاریہ دیوان ''خمیازۂ حیات'' شائع کرچکی ہے،اوردو کتابیں''احوال ومقامات''اور''مختصر سیرت خیرالبشر'' طباعت کے مراحل میں ہیں۔

مصنف کتاب مولانا محمد عبدالہادی قادری بدایونی حضرت عاشق الرسول مولانا محمد عبدالقدیر قادری بدایونی کے صاحبزادے،حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادہ خانقاہ قادریہ بدایوں کے برادرا کبر،اوراس ناکارہ راقم سطور کے تایا تھے۔

آپ کی ولادت ۱۳؍رجب المرجب ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ءکو بدایوں میں ہوئی،تعلیمی مراحل اپنے آبائی مدرسے مدرسہ قادریہ میں طے کیے۔اساتذہ میں والد ماجد کے علاوہ حضرت مفتی حبیب الرحمٰن قادری بدایونی اور حضرت مولانا عزیز احمد قادری بدایونی کے نام قابل ذکر ہیں،بچپن میں سرکار صاحب الاقتدار شاہ عبدالمقتدر قادری بدایونی قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور والد ماجد کے وصال کے بعدان کے جانشین اوراپنے چھوٹے بھائی حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری زیب سجادۂ خانقاہ قادریہ کے ہاتھ پرتجدید بیعت کی، مدرسہ قادریہ، جامعہ عثمانیہ حیدرآباداور نظام کالج حیدرآبادسمیت مختلف اداروں میں ادبِ عربی کے استاذ رہے،۱۹۷۸ء میں نظام کالج حیدرآباد کے شعبۂ عربی سے استاذ ادبیات عربی کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔جیداور وسیع المطالعہ عالم دین ہونے کے علاوہ عربی ادب ان کا خاص میدان تھا،عربی، فارسی،اُردو تینوں زبانوں کے قادر

الکلام شاعر اور صاحب طرز انشا پرداز تھے۔

دولت فقر اور مشرب تصوف وسلوک خاندانی ورثہ کے طور پر پایا تھا، ان کی اپنی قلندرانہ شان، طبیعت کے سوز وگداز اور عشق ومستی کی واردات نے ان کے سلوک کو مزید جلا بخشی تھی، اسی کا اثر تھا کہ ہر قسم کا آرام اور آسائش ترک کر کے زندگی کے آخری سات آٹھ سال شہر سے باہر ویرانے میں حضرت بابا بہاء الدین انصاری قدس سرہٗ کی درگاہ (دولت آباد ضلع اورنگ آباد مہاراشٹر) کی ایک تنگ وتاریک کوٹھری میں چٹائی پر گزار دیئے۔

کہتے ہیں کہ مٹی کی کشش آدمی کو کھینچ لاتی ہے، ان کو بھی بدایوں کی مٹی نے اپنی طرف کھینچا، اور وفات سے چند ماہ قبل حضرت صاحب سجادہ اصرار کر کے ان کو بدایوں لے آئے، یہیں ۱۱رمحرم الحرام ۱۴۱۵ھ/۲۲رجون ۱۹۹۴ء کو انتقال فرمایا اور درگاہ قادری میں آسودۂ خاک ہوئے۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

آخری دنوں میں استغراقی کیفیت طاری ہوگئی تھی ایک دن اچانک مجھ سے فرمایا ''شعر سمجھتے ہو؟'' میں نے کہا ''ہاں تھوڑا بہت''، فرمایا ''تو سنو'':

ابھی مزار پر احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے

اس کے بعد دیر تک روتے رہے۔

وفات سے کچھ ماہ پہلے ان کے ساتھ درگاہ قادری میں حاضر تھا، مزارات پر لگی ناموں کی تختیاں بلند آواز سے پڑھتے رہے پھر فرمایا ''یہاں سب کے نام کی تختیاں لگی ہیں میرے نام کی تختی نظر نہیں آرہی ہے''۔ کچھ ماہ بعد درگاہ قادری کے شمالی دالان میں مولانا عبدالماجد بدایونی اور حکیم عبدالقیوم شہید قادری کے درمیان ان کے نام کی تختی بھی لگ گئی۔ رحِمَہ اللہ تعالی

۱۱رشوال ۱۳۹۹ھ میں عرس قادری کے موقع پر صحن درگاہِ قادری میں شاہ عین الحق عبدالمجید قادری قدس سرہ کے مواجہہ میں بٹھا کر انھوں نے میرا مکتب پڑھایا تھا جس میں دستور کے مطابق بسم اللہ پڑھا کر بچے کو حروف تہجی پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ گویا میری پہلی درسگاہ تھی اور وہ میرے پہلے استاذ۔ تعلیمی مراحل کی تمام عمارتیں انھیں حروف تہجی کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہیں، آج جو بھی

دو چار لفظ لکھنا پڑھنا آتے ہیں یہ شاید اسی مضبوط بنیاد کا نتیجہ ہیں جو انھوں نے شاہ عین الحق کے مواجہہ میں بیٹھ کر رکھی تھی۔

ان کا معمول تھا کہ عرس قادری کی ہر محفل میں دیگر تازہ نعت ومناقب کے علاوہ اپنے پیرومرشد سرکار شاہ مطیع الرسول محمد عبدالمقتدر قادری بدایونی کی منقبت میں ایک ''ساقی نامہ'' بھی پیش کیا کرتے تھے،، ساقی نامہ پڑھنے کا بھی ان کا اپنا خاص انداز تھا، وفور جذبات سے رقت کی ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی کہ خود بھی زار وقطار روتے اور محفل بھی اشک بار ہوئے بنا نہ رہتی۔ اس ساقی نامے کے آخر میں خاندان کے بچوں کے لیے دعائیہ شعر بھی ہوتے تھے، میری پیدائش کے بعد وہ ہر سال عرس قادری میں اپنے سرکار مقتدر کے وسیلے سے رو رو کر یہی دعائیں کرتے تھے:

اسیدؔ کو ملے اعزاز وشانِ فضل رسول — عدوِ دیں پہ پکڑ ہو شدید اے ساقی
ہیبت حق ہو عیاں روئے اسید الحق سے — شیر بن جائے یہی شیر کا بچہ ساقی
چمکے چمکائیں اسیدؔ اور عطیفؔ واحمدؔ — پھیلے عالم میں ترے گھر کا اجالا ساقی
یہ اسیدؔ وعطیفؔ وفضل ؔرسول — تیرا چمکائیں نام اے ساقی

جس مقام پر وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے اپنی نااہلی کی وجہ سے وہاں تک تو نہیں پہنچ پایا لیکن یہ کہنے کا حق ضرور رکھتا ہوں کہ درگاہ قادری میں ان کے بہائے ہوئے آنسو بالکل رائیگاں بھی نہیں ہوئے۔ کاش آج وہ موجود ہوتے تو سرکار مقتدرؔ کے فیض اور اپنی دعاؤں کی قبولیت کو دیکھ کر مجھے سینے سے ضرور لگا لیتے۔

عربی فارسی اردو تینوں زبانوں میں انہوں نے خوب لکھا مگر طبیعت میں عجیب وغریب شان استغنا اور قلندری تھی، کبھی مضامین اور شاعری وغیرہ محفوظ کرنے یا باقاعدہ شائع کروانے کی طرف توجہ نہیں کی، بے شمار اردو عربی مضامین شاگردوں اور دوستوں کے نام سے شائع کروا دیے، ایک بہار یہ مجموعہ نذر آتش کر دیا، اور جو کچھ باقی رہ گیا وہ زمانے کی دست برد کا شکار ہوا، اکابر خانقاہ قادری کی سیرت وسوانح پر ایک کتاب ''احوال ومقامات'' تصنیف کی، جو ۱۹۹۱ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی اس کے علاوہ نعت ومناقب کے دو مجموعے ''نغمہ قدسی اساس'' اور خرابات'' برادرم فرید اقبال قادری صاحب نے بالترتیب ۱۴۲۱ھ اور ۱۴۲۲ھ میں کراچی سے شائع کیے، بہار یہ

شاعری کا ایک مجموعہ ''خمیازۂ حیات'' گزشتہ دنوں تاج الفحول اکیڈمی نے شائع کیا ہے۔ سیرت طیبہ پر ایک مختصر اور جامع رسالہ طباعت کے مراحل میں ہے۔

اس مطبوعہ مواد کے علاوہ ان کی بکھری ہوئی شعری اور نثری نگارشات کا مختصر انتخاب ''باقیات ہادی'' آپ کے ہاتھ میں ہے۔

عربی اردو میگزین الاشعة

۶۰ اور ۷۰ کی دہائی میں ان کے زیر نگرانی شعبۂ عربی نظام کالج حیدرآباد سے ایک عربی اردو میگزین الاشعہ جاری ہوا، جس کے اردو حصے میں مضامین اپنے اصلی نام سے اور عربی حصے میں کبھی اصلی نام سے اور کبھی **صاحب القلم الاحمر** یا **الاستاذ الاموی** کے فرضی ناموں لکھتے تھے، اس میگزین کے کئی شمارے ہمارے پیش نظر ہیں، اس میں آپ کا نام مشیر اعلی کی حیثیت سے شائع ہوتا تھا، خود ان کے علاوہ شعبۂ عربی کے طلبہ کے اردو عربی مضامین شائع ہوتے تھے ،مضامین میں اسلوب کی یکسانیت اور موضوعات کو دیکھ کر یہ قیاس کرنا مشکل نہیں ہے کہ یہ سب کے سب مضامین حضرت ہادیؔ ہی کے زور قلم کا نتیجہ ہیں، اس قیاس کے علاوہ ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان مضمون نگاروں میں سے بعض کو ہم شخصی طور پر جانتے ہیں کہ ان کو عربی نہیں آتی ہے اور نہ ہی وہ اس معیار کے اردو مضامین لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے حضرات کے مضامین ہم نے زیر نظر کتاب میں شامل کر لیے ہیں، جن کی طرف ہم آگے اشارہ کریں گے۔

پروفیسر ایوب قادری کی کرم فرمائی

عم مکرم حضرت ہادی القادری کے عربی مضامین اور عربی قصائد ترتیب دیتے وقت بے ساختہ ذہن پروفیسر ایوب قادری صاحب کے چھوڑے ہوئے ایک شگوفے کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ۱۹۷۵ء میں حضرت مولانا عبدالواحد قادری بدایونی (ابن مولانا عبدالماجد بدایونی) کی وفات ہوئی، اس پر پروفیسر صاحب نے لکھا:

> ''بڑی خوبیوں کے بزرگ اور اپنے اسلاف کے صحیح جانشین تھے، مولانا فضل رسول بدایونی کے خاندان میں اب کوئی شخص عربی جاننے والا نہیں رہا، یہ آخری

رکن تھے، دوسو سال سے جس خاندان میں قال اللہ قال الرسول کا چرچا تھا اب بالکل معدوم ہو گیا''۔

(مکتوب ایوب قادری بنام حکیم محمد موسیٰ امرتسری محررہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۵ء، مشمولہ تذکرۂ اکابر اہل سنت پاکستان: علامہ عبدالحکیم شرف قادری، ص ۲۷۸، اسلامک پبلی کیشنز کانپور سنہ ندارد)

قادری صاحب کی اس بات پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے اس کے جواب میں ہم زیرنظر کتاب ''باقیات ہادی'' کے عربی صفحات پیش کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں، یاد رہے کہ جس زمانے میں مولانا عبدالواحد قادری صاحب کی وفات ہوئی اسی زمانے میں سابق الذکر عربی میگزین **الاشعة** نکل رہا تھا، جس میں مولانا فضل رسول بدایونی کے پرپوتے حضرت ہادی القادری عربی نثر و نظم میں اپنی مہارت کا ثبوت دے رہے تھے، اب اگر عربی میگزین ''**الاشعة**'' کے شمارے یہ خیال کر کے پروفیسر ایوب قادری صاحب کو نہ بھیجے گئے ہوں کہ یہ صرف ''عربی جاننے والوں'' کو بھیجے جائیں گے، تو اس میں ''مولانا فضل رسول بدایونی کے خاندان'' کا کوئی قصور نہیں:

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

حضرت ہادیؔ مولانا عبدالواحد بدایونی کی وفات کے بیس سال بعد تک باحیات رہے اور عربی نظم و نثر اور علوم اسلامیہ میں اپنی مہارت کا ثبوت دیتے رہے۔ خیر یہ تو پرانی بات تھی، کاش ڈاکٹر ایوب قادری صاحب آج باحیات ہوتے تو میں اطلاعاً اتنا ضرور عرض کرتا کہ آج بھی ''مولانا فضل رسول بدایونی کے خاندان'' کے کچھ افراد عربی اور ''قال اللہ قال الرسول'' (علوم اسلامیہ) میں مہارت نہ سہی الحمدللہ تھوڑی بہت شُد بُد ضرور رکھتے ہیں، فَهَل مِن مُبارِز ؟؟؟؟

باقیات ہادی

زیرنظر مجموعے میں اس مواد کا انتخاب ہے جو عجلت میں دستیاب ہو سکا، اس کو ہم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے

(الف) **مضامین ہادی**۔ اس میں مندرجہ ذیل مضامین ہیں:

ا۔استاذ الاساتذہ (۲) عیداورعیدی (۳) رغم الانف (۴) عرب اور سفارت (۵) عربوں کا فن حرب (٦) عرب اور کتا (۷) دھوپ چھاؤں (۸) خطیب اور خطبہ۔

استاذ الاساتذہ اسی سال ماہنامہ جام نور دہلی میں شائع ہو چکا ہے، عید اور عیدی عرس قادری کی روداد ''ریاض میکشی'' (۱۳۹۰ھ) میں شائع ہوا تھا، رغم الانف کی نقل کتب خانۂ قادری میں محفوظ تھی، یہ اگر چہ ڈاکٹر مسعود صاحب کے نام ایک خط ہے مگر طوالت اور موضوع کو دیکھتے ہوئے اس کو مضامین میں شامل کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوا، ان کے علاوہ باقی مضامین الاشعہ سے لیے گئے ہیں، دھوپ چھاؤں حضرت ہادیؔ کی ہمشیرہ کے نام سے اور خطیب اور خطبہ حضرت ہادی کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری کے نام سے الاشعہ میں شائع ہوا تھا۔

(ب) **مکاتیب ہادی**۔اس میں حضرت صاحب سجادہ کے نام خطوط خود ان کے ذخیرۂ خطوط سے لیے گئے ہیں، حضرت عبدالمجید اقبال قادری صاحب کے نام خطوط انہوں نے کراچی سے دستیاب کروائے، مکتوب بنام مفتی عزیز احمد صاحب کی نقل کتب خانہ قادریہ میں محفوظ تھی، اور پھر ایک نقل اورنگ آباد سے بھی دستیاب ہوئی۔حافظ عبدالمولیٰ قادری بریلوی (م دسمبر ۱۹۹۱ء) استاذ الحفاظ حضرت سید عبدالکریم قادری بریلوی کے صاحبزادے، اور حضرت ہادی القادری کے بے تکلف دوست تھے، ان کے نام مکتوبات ان کے صاحبزادے الحاج عبدالسبحان صاحب قادری بریلوی نے عنایت کیے۔ڈاکٹر اسعد بدایونی جدید لب و لہجے کے معروف شاعر اور علی گڑھ میں شعبۂ اردو کے استاذ تھے، ان کے نام خط کی نقل اورنگ آباد سے حاصل ہوئی۔مولانا معین الدین قادری جیلانی سلطان پور کے رہنے والے، مدرسہ قادریہ بدایوں کے فاضل، عدالت عالیہ (حیدرآباد) میں حضرت عاشق الرسول کے پیش کار اور حضرت ہادی القادری کے بے تکلف دوست تھے، بعد میں حضرت ہادی کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری کی شادی ان کی صاحبزادی سے ہوئی۔ان کے نام خط بھی اورنگ آباد سے دستیاب ہوا۔

(ج) **فغان ہادی** ۔اس حصہ میں پہلے عربی پھر فارسی، پھر اردو نعت و مناقب اور اس کے بعد ردیف وار غزلیات کو شامل کیا گیا ہے، جن غزلوں پر تاریخ و سنہ موجود تھی اس کو درج کر دیا ہے

تا کہ عہد کا اندازہ ہو سکے، اس حصہ میں شامل عربی، فارسی اردو منظومات کا زیادہ تر حصہ حضرت ہادی کی صاحبزادی بیگم سید اکرام احمد رزاقی نے فراہم کیا ہے، اور کچھ اردو غزلیات حضرت ہادی کی ہمشیرہ بیگم خواجہ احتشام الدین قادری نے عنایت کیں۔ دصفغان ہادی میں شامل تخلیقات دو ایک کو چھوڑ کر سب پہلی بار شائع ہو رہی ہیں۔

(د) **مقالات الاموی**۔ الاشعہ میں چونکہ وہ ''الاستاذ الاموی'' کے نام سے عربی مضامین لکھتے تھے اس لیے عربی مضامین کے حصے کا نام مقالات الاموی رکھا ہے، اس میں موجود سبھی ٦ مقالات الاشعہ سے لیے گئے ہیں، ایک مضمون البطش و الرحمۃ ان کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری کے نام سے شائع ہوا تھا۔

نہایت عجلت میں جو کچھ حاصل ہو سکا اس کا مجموعہ حاضر خدمت ہے، میرے خیال سے حضرت ہادی کی اب تک کی شائع شدہ نگارشات ان کی اصل کاوشوں کا نصف بھی نہیں ہیں، الاشعہ کے سب شمارے دستیاب ہوں، اور کچھ روز مجھے حیدرآباد اور اورنگ آباد میں قیام کی فرصت ملے تو اور بہت سا مواد جمع ہو سکتا ہے۔

آخر میں حضرت صاحب سجادہ خانقاہ قادریہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جو حضرت ہادی کے بھائی تو ہیں ہی مرشد طریقت بھی ہیں، انہیں کے حکم سے میں نے اس کام کا آغاز کیا اور انہیں کی دعاؤں کے نتیجے میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

ترتیب و تصحیح میں جو بھی خامیاں رہ گئی ہیں ان سب کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے رب قدیر و مقتدر کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ میری خامیوں اور کوتاہیوں کی پردہ پوشی فرمائے اور مجھے اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔

اسید الحق قادری	۲۴ر ذوالحجہ ۱۴۳۰ھ
مدرسہ قادریہ بدایوں	۱۲ر دسمبر ۲۰۰۹ء



مضامین ہادی

استاذ الاساتذہ

مفتی اکرام احمد لطف بدایونی کی حیات اور شاعری
ایک جائزہ

بدایوں ایک قدیم شہر اور علمی مرکز کی حیثیت سے برصغیر میں خاص شہرت رکھتا ہے۔شرفائے بدایوں میں صدیقی حمیدی خاندان تعداد کے اعتبار سے سب سے بڑا خاندان ہے۔ ذیلی طور پر اس خاندان کی تقسیم تین گھرانوں میں ہے۔ بڑے صاحبزادے افضل محمد، دوسرے صاحبزادے غلام محمد اور تیسرے صاحبزادے محمد ماہ کی اولادیں حمیدی گھرانے ہیں۔ان تین حمیدی گھرانوں میں پہلی شاخ تعداد میں سب سے کم، دوسری شاخ پہلی سے زیادہ اور تیسری شاخ سب سے زیادہ ہے۔ یہاں جن کا تذکرہ مقصود ہے ان کا تعلق افضل محمدی گھرانے سے ہے۔اس گھرانے کے لوگ اپنے علمی وقار کی وجہ سے مفتی کہلاتے ہیں۔

مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ کا نام مفتی اکرام احمد اور لطفؔ تخلص تھا۔نسباً صدیقی مسلکاً حنفی اور ارادۃً قادری تھے۔ یہ اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ان کے والد مفتی غلام جیلانی علیہ الرحمۃ کا شمار شہر کے عمائد میں تھا۔ظاہری دولت کے ساتھ نعمتِ علم وفن اور باطنی سوز و گداز سے قلب معمور تھا۔

مفتی غلام جیلانی علیہ الرحمۃ کو فن تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ بلا تکلف گفتگو کے جملے بھی اعداد جمل کے اعتبار سے تاریخی ہوتے تھے۔ چچا علیہ الرحمۃ (مولانا مفتی کرم احمد میخوارؔ قادری فرزند اوسط) نے سنایا کہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے ایک صاحب فن آئے۔ان کی تاریخ گوئی کا بڑا چرچا تھا۔ والد صاحب قبلہ اُن سے ملنے گئے اور گفتگو شروع کی، گفتگو اتنی رواں اور بے تکلف تھی کہ یہ

شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ ان جملوں میں فن برتا جارہا ہے۔ وہ صاحب خالی الذہن تھے کہ مقابل صاحب فن ہے اس لئے والد صاحب کو جواب میں وہ خوبی نہ ملی۔تھوڑی دیر بعد یہ کھڑے ہوگئے اور فرمایا ''رخصت''، تو لکھنوی صاحب کو محسوس ہوا کہ مفتی صاحب غفلت میں چوٹ دے چلے تھے۔(رخصت کے اعداد بحساب جمل بارہ سونوّے '۱۲۹۰' ہوتے ہیں)انہوں نے ہاتھ پکڑ لیا پھر بیٹھ کر دیر تک دونوں فن کا مظاہرہ کرتے رہے''

ان کی کہی ہوئی متعدد تاریخیں ان کے مجیدی پیر بھائیوں کے مزاروں پر کندہ ہیں۔ وہ فن میں ندرتیں پیدا کیا کرتے تھے۔مثلاً درگاہ قادری کے عرس ۱۳۰۰ھ کی تاریخ انھوں نے اپنے تینوں صاحبزادوں اور دو پوتوں کے ناموں سے اس طرح نکالی ہے کہ ان پانچوں کے آخری حروف کے اعداد کو پانچ سے ضرب دو۔

فضلؔ وکرمؔ،اکرامؔ وحسینؔ وصدیقؔ　　　پانچوں کے ہیں پنج گونہ حرفِ آخر

۳۰+۴۰+۴۰+۵۰+۱۰۰=۲۶۰×۵=۱۳۰۰ فھو المقصود

مفتی اکرام احمد لطفؔ علیہ الرحمہ کو ذہانت اور فن سے لگاؤ وراثت میں تو ملا ہی تھا،سونے پر سہاگہ یہ کہ اس زمانے سے ہی کہ ''پجمیا'' (یہ لفظ انھیں کا ہے، پاجامے کی تصغیر) نہیں سنبھلتی تھی مدرسہ قادریہ پہنچادئے گئے جہاں اس وقت ''باوا'' (مولانا نور احمد قادری تلمیذ علامہ فضل حق خیرآبادی) اور حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری بدایونی (میاں حضرت) مسند درس پر جلوہ افروز تھے۔بحرالعلوم علامہ محمد علی قادری کے پوتے اور مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی کے صاحب زادے حضرت مولانا حکیم سراج الحق قادری رحمۃ اللہ علیہ (پھوپا صاحب) اور حضرت مولانا مطیع الرسول عبدالمقتدر قادری قدس سرہٗ فیض بار تھے۔مفتی لطفؔ کو سب کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ جواں سال استاذ (صاحب الاقتدار مولانا عبدالمقتدر قادری قدس سرہٗ) کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے۔اس وقت تک استاذ پر وہ استغراقی کیفیت مستولی نہیں ہوئی تھی جو بعد میں دیکھی گئی۔ استاذ نے شاگرد میں جوہر قابل محسوس کیا اور شعور ادبی کو نکھارنے پر ایسی توجہ فرمائی جس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔

مفتی لطفؔ نے بتایا کہ ''استاذ نے شعر کہنے کا حکم دیا،روز طرح دی جاتی،شعر کہنے کی ہدایت

فرمائی جاتی، طرح میں مصرعہ کم دیا جاتا، اکثر قافیہ دیا جاتا، ردیف اور بحر کا انتخاب ہمیں خود کرنا پڑتا۔ ہم دن بھر فکر سخن کرتے، عشا کے بعد جب وہ زنانے مکان تشریف لے جاتے تو ہم دروازے تک ساتھ جاتے اور کاغذ ان کے ہاتھ میں پکڑا دیتے۔ فجر کے بعد پھر ساتھ جاتے تو دروازے میں تخت پر بیٹھ کر ہماری غزل ہمارے ہاتھ میں دی جاتی۔ جو اصلاحات سے پر ہوتی۔ ہم پڑھ چکتے تو پوچھا جاتا یہ ترمیم کیوں کی گئی، یہ لفظ کیوں بدلا گیا؟ اس تقدیم تاخیر کی کیا وجہ ہے؟ ہم جوابات دیتے تو فرماتے سمجھ گئے۔ پھر غزل ہم سے مانگ کر کاغذ چاک کر دیا جاتا۔ آج کے لئے تازہ طرح مل جاتی اور ہم پھر دن بھر فکر سخن میں مبتلا رہتے۔

روزانہ طرح دینے، رات کو ہماری دن بھر کی کاوش ساتھ لے جانے، صبح ترمیمات دکھانے اور باریکیاں سمجھا کر غزل چاک کر دینے کا یہ سلسلہ پورے سال بھر جاری رہا۔ اب اصلاح اکثر نہ ہوتی، ایک آدھ لفظ کا الٹ پھیر ہوتا، وہ بھی کبھی کبھی، مگر غزل ہمیں واپس نہ ملتی اور چاک کر دی جاتی۔ اب ہمیں کوفت ہونے لگی کہ اگر ہماری غزلیں جمع ہوتیں تو ہم صاحب دیوان ہو چکے ہوتے۔ تین سو ساٹھ غزلیں تو ہوتیں ہی۔ دو غزلے سہ غزلے کا شمار نہیں۔ آخر ایک روز جب انھوں نے چاک کرنے کے لئے کاغذ مانگا تو ہم نے ہمت کر کے ہاتھ کھینچ لیا اور صاف کہہ دیا اب ہم غزل پھاڑنے نہیں دیں گے۔

سال بھر کی اس گھسائی کے بعد کہیں ہماری بیاض بن پائی۔ اس کے بعد پھر کوئی غزل چاک نہیں کی گئی۔ کئی مہینے گذر گئے۔ ہماری بیاض میں بہت سی غزلیں جمع ہو گئیں۔ آخر ایک روز جمعہ کی نماز کے بعد جب مدرسہ قادریہ میں سب بیٹھے اور شعر و شاعری کا دور شروع ہوا تو استاذ نے پہلی بار ہم سے فرمایا ''اکرام احمد آج تم کچھ سناؤ''۔ ہمارا سینہ مارے خوشی کے اتنا (اشارہ کرتے ہوئے) بڑا ہو گیا کہ آج نے اس قابل سمجھا کہ ان بزرگوں کے سامنے ہمیں شعر پڑھنے کا موقعہ دیا۔ ہم نے بیاض نکال کر جلدی جلدی ورق الٹنے شروع کئے تا کہ ایسی غزل کا انتخاب کریں جس سے ہمارا مرتبہ قائم ہو جائے اور ایک بانکی غزل شروع کی تو استاذ نے روک دیا۔ یہ نہیں وہ غزل سناؤ (جسے ہم نے ان سے چھین لیا تھا) اب جو ہم وہ غزل نکالتے ہیں تو اپنی نگاہ میں ہی نہیں جچتی۔ بڑی چہ کنم میں رہے کچھ سوجھا ہی نہیں۔ جھٹ سے وہ صفحہ پھاڑ پرزہ پرزہ کر دیا تو استاذ نے مسکرا کر

فرمایا ''جب ہم پھاڑتے تھے تو ہاتھ کھینچ لیا تھا، اب خود پھاڑ پھینکی''۔

آئینہ سازی کی یہ داستان مفتی علیہ الرحمہ نے متعدد مرتبہ سنائی ہے۔ پھر بھی آج جب میں اسے لکھ رہا ہوں تو ممکن ہے اس میں لفظی تغیر ہو گیا ہو کیونکہ میرا شمار راویانِ حدیث میں نہیں ہے مگر نفس واقعہ میں حقیقت سے سرِ مو تجاوز نہیں ہوا ہے۔

شعر کے سلسلہ میں مفتی لطفؔ سے جو خصوصی مشق کروائی گئی اس کی وجہ ان کی صلاحیتوں کو ان کے استاذ کا محسوس کر لینا تھا، چنانچہ مفتی جی کو دیکھنے والے ابھی سیکڑوں موجود ہوں گے انھوں نے انھیں ''چوبیس گھنٹے شاعر'' ہی دیکھا ہوگا۔ اکثر کو تو یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ وہ ژولیدہ موشاعر جید عالم بھی تھا۔ نہ صرف علوم ادبیہ پر اس کی نگاہ تھی، منطق فلسفہ، تفسیر حدیث اور فقہ کا کونسا مسئلہ ہے جو اسے معلوم نہ تھا۔ مگر مفتی جی نے جو صرف خاندانی اعتبار سے ہی نہیں اپنے علم کے اعتبار سے بھی مفتی کہلائے جا سکتے تھے۔ خود کو شاعر کے علاوہ کسی اور حیثیت سے روشناس نہیں کرایا۔

مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ کا شمار اردو کے مسلم الثبوت اساتذۂ فن میں کرنا چاہیے۔ وہ ہر صنف سخن پر قدرت رکھتے تھے۔ فن کے غوامض پر نگاہ تھی۔ اس لئے محاسن کو برتنے اور معائب سے اجتناب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے یہاں ہر قسم کا شعر ملتا ہے لیکن اسقام سے بہر حال پاک ہوتا ہے۔ ایک طویل غزل فرمائی، پہلا مطلع تھا ؎

رات تو ہم یہ سمجھے تھے صبح نہیں اب ہونے کی　　　سونا کیسا فرقت میں فکر میں تھے جی کھونے کی

کیسا کیفیت میں ڈوبا ہوا مطلع ہے مگر پھر ایک مطلع فرمایا ؎

پھل ملتا ہے برائی کا کیجئے اس میں جو نیکی　　　کس نے رسم نکالی ہے تخمِ الفت بونے کی

اسے استاذی کے علاوہ میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اسے کیا کہوں کہ اسی پر بس نہیں کیا، ارشاد فرمایا ؎

ہاتھ کا چھلا چاندی کا کان کی دُر یا سونے کی　　　ان کی یہ دونوں چیزیں ہیں ہوش ہمارے کھونے کی

تو عرض کر ہی گذرا ''استاذ اس مطلع کی کیا ضرورت تھی؟'' فرمایا ''حقیقت واقعہ ہے تو اس کے اظہار کو کیوں معیوب سمجھا جائے''۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا، مگر تان تو یہاں جا کر ٹوٹی ؎

پھنس کر اپنے پھندے میں اُڑ گئی چڑیا سونے کی

بہر حال اس قسم کے اشعار بھی فنی اور لسانی اعتبار سے کسی طرح کم رتبہ نہیں کہے جا سکتے۔ مزاج چونکہ عاشقانہ صادقانہ تھا اس لئے بے اختیارانہ اس قسم کے اشعار کہہ جایا کرتے تھے۔ اپنی اس فطری کمزوری کو خود تسلیم کرتے ہیں

بلا سے اپنی کوئی ہو مگر ہاں آئینہ رو ہو جناب لطفؔ ہیں لطف صفائی دیکھنے والے

ایک غزل سنائی جس کی ابتدا یوں ہوئی تھی

کچھ کھا کے سو رہیں یہی آتا تھا جی میں رات

مگر پھر جو جذبات میں موڑ آیا ہے، بات کہاں سے کہاں پہنچی

باقی نہیں رہی کوئی امید جی میں رات سوئے گلے لگا کے انھیں چاندنی میں رات

اور

وقت سخن وہ طرز تبسم نہ پوچھئے تارے چمک رہے تھے کسی کی ہنسی میں رات

پھر تان یہاں جا کر ٹوٹی

اک سانسئے نے لوٹ لیا سانسنی میں رات

سانسنی علی گڑھ کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں مشاعرے میں استاذ نے شرکت کی تھی، سانسنی کی مشابہت سے اس وقت کا آئینہ رو غارت گر ہوش سانسیا بن گیا، جو ایک خانہ بدوش قبیلہ ہوتا تھا ممکن ہے اب بھی ہوتا ہو مگر مجھ میں دشت نوردی کی ہمت کہاں ہے۔

لطفؔ کی شاعری میں خاص لطف اس وجہ سے اور بھی پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اردو شاعری کے دونوں مدرسوں دہلی اور لکھنؤ سے مساویانہ استفادہ کرتے ہیں۔ جہاں تک زبان اور محاورے کا تعلق ہے ان کے یہاں دہلویت جلوہ گر نظر آتی ہے اور جہاں فنی نزاکتوں کی طرف توجہ کی ہے وہ لکھنوی بن گئے ہیں۔ اوپر جو اشعار گذرے ہیں ان سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ دیوان سامنے نہیں ورنہ سیکڑوں مثالوں سے وضاحت کی جا سکتی تھی۔

مفتی لطفؔ کو نام و نمود سے کسی قسم کا واسطہ نہ تھا۔ مشاعروں میں بھی بہت کم شرکت کرتے تھے مگر اس زمانے کے نامور اساتذہ انھیں خاص رتبہ دیتے تھے چنانچہ میں نے خود دو بزرگ

ہستیوں کو ان سے ملتے دیکھا ہے اور محسوس کیا ہے کہ بڑے ہی بڑائی کو سمجھ سکتے ہیں۔ وہ دونوں حضرت سید علی احسن احسنؔ مارہروی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت سید حسین احمد بیباکؔ شاہجہاں پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

اس گوشہ نشینی کے باوجود مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ کی ایک غزل تو ہندوستان میں ایسی مشہور ہوئی کہ گلی گلی گائی جاتی تھی۔ اب تو غالبًا کوئی یہ جانتا بھی نہ ہو کہ وہ حضرت مفتی لطفؔ ہی تھے جنھوں نے کہا تھا

تو وہ مہ خوبی ہے اے جلوۂ جانانہ ہر گل ہے ترا بلبل ہر شمع ہے پروانہ
مستی میں بھی سر اپنا ساقی کے قدم پر ہو اتنا تو کرم کرنا اے لغزشِ مستانہ
یارب انھیں ہاتھوں سے پیتے رہیں متوالے یا رب یہی ساقی ہو یا رب یہی میخانہ

مفتی علیہ الرحمہ کو مشکل زمینوں میں طبیعت کے جوہر دکھانے کا خاص ملکہ تھا۔ جہاں ایک آدھ شعر کہنا بھی دشوار نظر آئے وہاں وہ سیر حاصل غزل فرماتے تھے اور کمال یہ تھا کہ یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ زبردستی قافیہ پیمائی کی گئی ہے۔ اس وقت چند شعر یاد آرہے ہیں، فرماتے ہیں

میری قسمت ہو اگر ساغر میں ساغر ہاتھ میں عمر بھر ساقی رہے چکر میں چکر ہاتھ میں

یہ چکر میں چکر آدمی کو گھن چکر بنا ڈالے مگر استاذ نہایت حسن و خوبی سے اس سے عہدہ برا ہوئے ہیں

ہاتھ سے صیاد کے اب بچ کے جانا ہے محال قوت پرواز ہے شہپر میں شہپر ہاتھ میں

ان کی بلند پروازیاں جاری رہتی ہیں، نعت کی طرف مڑ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں

اللہ اللہ شان اعجاز پیمبر دیکھئے طاقتِ گفتار ہو پتھر میں پتھر ہاتھ میں

اساتذہ کی زمینوں میں طبع آزمائی بڑی دشوار ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ کہنے والے نے حق ادا کیا ہو مگر مفتی علیہ الرحمۃ کی طبیعت ایسے میں بند نہیں ہوتی تھی بلکہ اکثر اس کا التزام کرتے تھے کہ انھیں قوافی میں مطلع ہو جن میں پیشرو کہہ گیا ہے۔ غالبؔ کی مشہور غزل ہے، دم نکلے، کم نکلے۔ غالبؔ کے قوافی میں یہ مطلع جان غزل ہے

دم آخر یہ حسرت تو الٰہی کم سے کم نکلے وہ انداز تبسم دیکھ کر آنکھوں سے دم نکلے

اب اسے غالبؔ کے مطلع سے ملا کر پڑھئے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　　بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

وہ ناآسودگی اور حسرت تمام جو ''یہ حسرت تو الٰہی کم سے کم نکلے'' میں ہے غالبؔ کے یہاں کہاں ہے؟

ناسخؔ کا ایک مطلع ہے اور حیرت ہے کہ ناسخ کا ہی مطلع ہے

دو چار حزیں اور پہنچ جائیں جو ہم سے　　　ہستی کی طرف منہ نہ کرے کوئی عدم سے

اپنے رنگ سے ہٹ کر بڑی نازک بات کہی ہے، اس کا جواب نہیں ہوسکتا، یہ اور بات ہے کہ آلام ہستی سے نبرد آزما یا پسپا ہو کر جانے والے جس عدم کی طرف جاتے ہیں وہ اس عدم سے علیحدہ ہے جس سے نکل کر آنے والے ہستی کی طرف آتے ہیں۔ پھر بھی اشتراک لفظی نے بات پیدا کر دی ہے جس کی داد نہ دینا کفریات ادبی یا کم سے کم بے ادبی میں ضرور شمار ہوگا۔

آ کا (مولانا عبدالماجد قادری بدایونی منظورؔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ، ہم سب انھیں ''آ کا'' ہی کہتے تھے۔ یہ ترکی لفظ ہے، بڑے بھائی کے معنیٰ میں) کے انتقال پر ایک عالم متاثر اور سوگوار تھا۔ مفتی لطفؔ کے لئے یہ دہرا صدمہ تھا، کیونکہ وہ حکیم شہید (مولانا حکیم عبدالقیوم قادری جوشؔ علیہ الرحمۃ، آ کا کے والد) کے دوستوں میں تھے۔ شہید مرحوم کے بعد انھوں نے ماجد میاں میں تسلی پا لی تھی کہ وہ بھی اچانک بچھڑ گئے۔ جلسۂ تعزیت ہوا، مقررین اور شعراء نے خراج عقیدت پیش کیا۔ مفتی جی نے ناسخؔ کی زمین میں درد والم کا اظہار کیا۔ انھیں قوافی میں یہ مطلع درد واثر کی کیسی نرالی شان رکھتا ہے۔

جانے کو تو جاتا ہے جو آیا ہے عدم سے　　　افسوس تو اس کا ہے یہ پہلے گئے ہم سے

اور آخر میں فرمایا

تھا لطفؔ سخن حضرتِ منظورؔ کے دم سے

لطفؔ سخن اور حضرت منظورؔ کے ساتھ ایک واقعہ یاد آ گیا۔ عرس قادری کا سارا اہتمام آ کا کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ اور مشاغل کے ایک شب مشاعرے کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ مشاعرہ طرحی ہوتا تھا، مقامی شعرا کے علاوہ باہر سے بھی بڑے بڑے شعرا اس میں شرکت کرتے تھے۔ ایک سال آ کا

نے بہت ہی مشکل طرح دے دی، غالباً ظہر کے بعد مفتی لطفؔ علیہ الرحمہ سے کہا ''مفتی جی! ایسی طرح دے دی ہے کہ ڈھنگ کے سات (صحیح یاد نہیں سات یا نو) شعر نکالنا بھی مشکل ہو جائے گا''۔ انھوں نے کہا ''ماجد ایسی باتیں نہیں کرتے، شعر کہنے والے کے لئے کوئی طرح مشکل نہیں ہوتی''۔ آ کا نے کہا ''سب باتیں ہیں، آپ بھی نو (یاد نہیں نو یا گیارہ) شعر سے زیادہ نہیں نکال سکیں گے''۔ انھوں نے کہا ''شرط رہی''، آ کا نے کہا ''رہی، جتنے شعر زیادہ ہوں گے ان کے حساب سے (صحیح یاد نہیں، نقد روپیہ یا سیر بھر مٹھائی) ادا کروں گا''۔

مفتی لطفؔ پنسل کاغذ لے کر شاعری کے اڈے پر پہنچ گئے (دوران عرس قادری اکثر درگاہ قادری کے پیچھے چبوترے پر بیٹھ کر فکر سخن کیا کرتے تھے) عصر کے قریب مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ آ کا نے دور سے دیکھ کر ہی محسوس کر لیا کہ شرط ہار دی۔ منا بھائی (استاذ کے عزیز شاگرد) آ کا کے پاس تھے۔ آ کا نے کہا، منا! مفتی جی کی غزل چراؤ، منا بھائی نے کہا یہ کیا بڑی بات ہے، پنسل کاغذ نیفے میں اڑسا ہوگا، ابھی لایا۔ لپکے اور ان کے درگاہ کے بڑے دروازے سے نکلنے سے پہلے ہی شاگرد استاذ کے پاس تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بنائیں اور آہستہ سے پائینچہ ذرا کھینچ دیا۔ غزل نیچے آ رہی، استاذ آگے بڑھے اور غزل شاگرد کی جیب میں پہنچی، منا بھائی نے اشارہ کر دیا کہ کام ہو گیا۔

مفتی لطفؔ دفتر عرس قادری کے شامیانے میں پہنچے، جہاں آ کا کی نشست رہتی تھی۔ آ کا نے کہا ''کیوں مفتی جی غزل کہلائے، کتنے شعر ہوئے؟'' انھوں نے بتایا (سترہ یا پچیس صحیح یاد نہیں)۔ آ کا نے کہا ''آؤ مشاعرے سے پہلے ہی ہم ایک دوسرے کو سنالیں اور تصفیہ ہو جائے''۔ اب جو مفتی جی نیفا ٹٹولتے ہیں تو کاغذ پنسل غائب، بہت سٹپٹائے۔ آ کا نے چوٹ کی ''غزل ہوئی بھی تھی یا ویسے ہی دھاک ڈال رہے تھے''۔ مفتی جی کو غصہ آ گیا فرمایا ''کیا ہوا؟ اتنے ہی شعر اور کہہ لوں گا'' اور پھر عصر سے مغرب تک اپنے مہبط شعر پر فکر سخن میں غرق رہے۔ مغرب کے بعد آ کا نے پھر کہا ''مفتی جی آؤ آپس میں غزلیں سنالیں''، مگر یہ راضی نہ ہوئے فرمایا ''اب تو مشاعرے میں ہی تصفیہ ہوگا''۔

مشاعرے میں آ کا نے غزل شروع کی تو وہی غزل تھی جو شاگرد نے چرا کر اِدھر پہنچا دی تھی،

مفتی جی تلملا رہے تھے کہ بھتیجا چوری کی غزل پڑھ رہا ہے مگر آ کا نے مقطع لطفؔ کا ہی پڑھا اور پھر اپنی مختصر غزل پڑھی اور جب شمع مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ کے سامنے آئی ہے تو محسوس ہوا کہ وہ اشعار جو سنائے جا چکے وہ تو نقش اولیں تھے، مشاعرے کے بعد آ کا نے شرط کے مطابق دونوں غزلوں کے مجموعی اشعار کے حساب سے جرمانہ ادا کیا اور لطف یہ ہے کہ وہ جرمانہ یا انعام اسی شاگرد رشید نے وصول کیا جس نے استاذ کی غزل چرائی تھی۔

ان کی قادرالکلامی کے ثبوت میں یہ ایک واقعہ ہی کافی ہے۔ اسی سلسلہ کا ایک اور واقعہ میں استاذ کی نعت گوئی کے ضمن میں بیان کروں گا جس سے قادرالکلامی کے ساتھ ساتھ بدیہہ گوئی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

یوں تو مفتی لطفؔ بہار یہ شعر میں بھی بلند مقام رکھتے تھے مگر نعت و منقبت تو جیسے ان کا حصہ ہے۔ جذبات کی فراوانی، آداب و احترام کا پاس اور صحت روایات ہر اعتبار سے ان کا یہ کلام بے مثال ہے۔

فرماتے تھے ''حقیقی عاشقانہ شاعری تو نعت و منقبت میں ہی کی جا سکتی ہے''۔ وہ ربط دروں جو ایک دستہ گرفتہ کو اپنے شیخ سے، ایک مسلمان کو اللہ کے محبوب رسول ﷺ سے ہونا چاہیے اس کا عشر عشیر بھی بڑے سے بڑے مجنوں لیلیٰ اور فرہاد و شیریں میں نہیں ہو سکتا لیکن نعتیہ شاعری جتنی حقیقی عاشقانہ ہے اتنی ہی دشوار بھی ہے کیونکہ یہاں قدم قدم پر گرفت ہے، پاس آداب جذبات اور اظہار دونوں کا دامن کشاں رہتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز مدرسہ قادریہ میں حضرت اقدس (حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری بدایونی) کو مفتی جی نے ایک نعت سنائی۔ مطلع سن کر حضرت اقدس نے فرمایا ''مفتی جی یہ آپ ہی کہہ سکتے تھے (مفتی پر خاص زور ہے)

اللہ رے شانِ حسن خدا سازِ مصطفیٰ وہ ذاتِ بے نیاز ہو اور نازِ مصطفیٰ

اس ''خداساز'' نے حضورِ بے نیاز، ناز کا کیسا موقعہ پیدا کر دیا ہے، سبحان اللہ۔

اسی نعت کا ایک اور مطلع ہے

انساں کا دل تو کیا دمِ اعجازِ مصطفیٰ پتھر میں گھر کرے قدمِ نازِ مصطفیٰ

غالبؔ کی زمین میں اوپر ایک مطلع کا تذکرہ کر چکا ہوں، اب اسے پھر پڑھئے اور یہ سمجھ کر پڑھئے کہ یہ نعت میں ہے تو اس کا اور ہی لطف محسوس ہوگا

دمِ آخر یہ حسرت تو الٰہی کم سے کم نکلے   وہ اندازِ تبسم دیکھ کر آنکھوں سے دم نکلے

حسنِ خاتمہ کی اس سے بہتر کیا صورت ہوسکتی ہے کہ جمال رحمت عالم بے حجاب سامنے ہو۔

دوسرا مطلع دیکھئے دو لفظوں کے الٹ پھیر سے کیا بات پیدا کی ہے

غمِ الفت ہے دم کے ساتھ دم نکلے تو غم نکلے   محبت کا مزا یہ ہے نہ غم نکلے نہ دم نکلے

زندگی ہو کہ موت دونوں ان کے ساتھ وابستگی سے ہی لذت آگیں بنتی ہیں۔ کیا خوب کہا ہے

یہ لطفِ زندگانی ہے کہ ہو نظارہ اس رُخ کا   مزا مرنے کا جب آئے کہ ان قدموں پہ دم نکلے

بغیر اقرار رسالت ہدایت ممکن نہیں، اسی کو عشق و محبت کی زبان میں کس خوبی سے بیان کیا ہے ۔

ہمارا کام تھا راہ محبت میں قدم رکھنا   تمہیں نے دستگیری کی تو اب کچھ پاؤں جم نکلے

ربط باہمی دیکھئے کیا بات ہے

اسے کہتے ہیں باہم دل سے دل کو راہ ہوتی ہے   اُدھر محشر میں وہ آئے، ادھر مرقد سے ہم نکلے

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ کی کیسی واقعاتی تفسیر ہے

یہ شانِ خلق ہے وہ بسملِ تیغ محبت ہو   جو گھر سے بہر قتلِ شاہ دیں کھا کر قسم نکلے

اسی طرح مناقب میں والہانہ شیفتگی اور عقیدت ہر ہر حرف سے مترشح ہوتی ہے

شریکِ غم ہمارا کون وقتِ بیکسی ہوگا   مگر ہاں ایک پیر اپنا فقیر قادری ہوگا

محبت میں کسی دن جان جائے گی یہی ہوگا   نہ غم ہوگا نہ دم ہوگا نہ ہم ہوں گے نہ جی ہوگا

فقیرِ قادری کے ہاتھ ہوگا قادری جھنڈا   غلامِ قادری زیرِ لوائے قادری ہوگا

جس کے کرم سے لطف کے سب کام بن گئے   وہ کون تھا وہ مقتدر کارساز تھا

ہماری بات جب پوچھی غلام پیر نے پوچھی   ہمارے کام جب آئے فقیر قادری آئے



بہار آئی چلے پیمانہ ساقی   رہے قائم ترا میخانہ ساقی

ادھر بھی بارش ابر کرم ہو   گھٹا آئی سوئے میخانہ ساقی

یہ چند شعر جو یاد آتے چلے گئے لکھے گئے، ورنہ نعت ومنقبت کا حصہ تو ان کے کلام میں سب سے زیادہ ہے جس کا قول یہ ہو کہ ''حقیقی عاشقانہ شاعری تو نعت ومنقبت میں ہی ہو سکتی ہے'' اس کا تو بہار یہ کلام بھی نعت میں ہی شمار ہو سکتا ہے۔ ایسے اشعار کو چھوڑ کر جس میں کچھ ایسے الفاظ آ گئے ہوں جنھیں وہ آداب نعت کے منافی سمجھتے تھے، سب کو نعت ومنقبت کہا جا سکتا ہے۔ اس سے قطع نظر کر لی جائے تب بھی کئی ضخیم جلدیں مولوی نثار احمد قادری صاحب نعت خواں کے پاس صرف لطفؔ کے کلام کی ہیں جن کی وہ کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دیتے۔

عرس قادری تو بطور خاص موسم شعر ونغمہ ہوتا تھا۔ ہر موقعہ پر تازہ بتازہ تصنیف ہوتی۔ معاصرین سے مسابقت رہتی، ہر ایک عرض ہنر کرتا۔ اس سلسلہ میں مولوی نثار احمد قادری صاحب نعت خواں نے بیان کیا کہ ''چادروں کا جلوس آ رہا تھا، مدرسہ قادریہ کے سامنے جماؤ ہوا۔ سب نعت خوانوں نے باری باری پڑھا، مولوی محمد حسین قادری صاحب نعت خواں بازی لے گئے۔ انھوں نے اقبالؔ کی غزل ''حجاز میں، نماز میں'' کی زمین میں مولانا ضیاء القادری کی غزل منقبت پڑھی۔ سماں بندھ گیا، میرے پاس اس کا جواب نہیں تھا، اس لئے مجمع سے نکل کر ایک طرف کو چل دیا۔

مفتی جی نے دیکھا تو لپکتے آئے، فرمایا ''کہاں جاتا ہے؟ اب تیری باری ہے''۔ میں نے ''کہا میں نہیں پڑھوں گا، میرے پاس اس غزل کا جواب نہیں ہے''، وہ سمجھانے لگے'' کیا ہوا، تیرے پاس اس سے بھی اچھی غزلیں ہیں''، بتاتے رہے'' وہ غزل پڑھ، اچھا وہ غزل پڑھ'' مگر میں نے ایک نہ مانی اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ مفتی جی پیچھے پیچھے سمجھاتے چلے آئے۔ جلوس پیچھے رہ گیا، ہم درگاہ قادری کے قریب قاضی حوض پر پہنچے تو مفتی جی کو میری ہٹ پر جلال آ گیا، فرمایا'' نکال پنسل کاغذ''، میں تو یہی چاہ رہا تھا، پنسل کاغذ لے کر قاضی حوض کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور شعر کہنا شروع کیا، ابھی دو چار شعر ہی ہوئے تھے کہ جلوس آ پہنچا، وہ شعر مجھے دیئے اور فرمایا'' تو پڑھنا شروع کر میں اور شعر دیتا ہوں''۔

جلوس چادر درگاہ قادری کے دروازے پر پہنچا، میں نے پڑھنا شروع کیا، میں دو شعر پڑھنے نہ پاتا کہ مفتی جی اور شعر دیدیتے۔ اس طرح وہ غزل کہتے گئے میں پڑھتا گیا، ایک سماں بندھ گیا۔ ساری اگلی پچھلی کسر نکل گئی اور جب میں نے یہ شعر پڑھا ہے

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

تب تو سارے مجمع پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ احسن میاں صاحب (حضرت احسنؔ مارہروی) دروازے کی دہلیز سے اترے، میرا منھ چوما اور اپنی شال اُڑھا دی''۔

یہ واقعہ بھی ان کی قادرالکلامی اور بدیہہ گوئی کا نا قابل تردید ثبوت ہے۔

مفتی لطف علیہ الرحمۃ کی یہ خصوصیت بھی ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے کہ وہ دوسروں کی پردہ پوشی کرتے اور اپنی اصلاح فوراً کر لیتے۔ اسی غزل میں جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ انھوں نے ایک جگہ حضرت اقدس (حضرت مولانا عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری بدایونی) کا لفظ قبول کر لیا اور دوسری جگہ خود ہی تصحیح کر لی۔ حضرت اقدس نے پوچھا، مفتی جی

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں

''ہماری بزم خیال'' کی بجائے ''کسی کی بزم خیال'' کیسا رہے گا، وہ کھل اُٹھے اور فرمایا ''بیشک کسی کی بزم خیال زیادہ بہتر ہے''۔ پھر حضرت اقدس نے پوچھا مفتی جی وہ کیا شعر ہے ''مہر قبولیت''۔ مفتی جی نے فرمایا ''کون کہتا ہے؟ مہر حق قبول ہے''، مفتی علیہ الرحمہ نے جلدی میں ''مہر قبولیت'' لکھ دیا تھا۔ حضرت کے پوچھنے پر فوراً غلطی سمجھ میں آ گئی، سہو ہو گیا تھا۔ ''قبول'' خود مصدر ہے، ت مصدری بیکار ہے، اسی لئے کہ ابھی اعتراض واضح بھی نہیں ہوا تھا، انھوں نے فرما دیا ''کون کہتا ہے؟ مہر قبول حق ہے''

تری ذات کا تو ہے ذکر کیا ترے ذکر کا ہے یہ مرتبہ کہ بجائے مہر قبول حق ہے درود تجھ پہ نماز میں

ایک واقعہ برادر محترم مولوی سید حسن حیرتؔ قادری صاحب نے سنایا کہ ''بدایوں میں ایک مشاعرہ تھا، ہم بھی گئے ہوئے تھے، شریک ہوئے۔ ایک بزرگ شاعر نے عربی سے ناواقفیت کی بنا پر ایک قافیہ غلط باندھا، ہماری ''رگِ علامیت'' پھڑکی اور ہم نے داد دی سبحان اللہ کیا قافیہ باندھا ہے مکرر ارشاد، وہ بزرگ شاعر ''مکرر ارشاد کرنے والے تھے'' کہ مفتی جی نے بھڑ بھڑا کر کہا'' آگے پڑھو، دوسرا شعر پڑھو'' اور انھیں بچا لیا۔ مشاعرے کے بعد جب ان بزرگ نے مفتی جی سے پوچھا کہ ''وہ صاحب داد دے رہے تھے، تم نے شعر مکرر پڑھنے نہیں دیا، کیوں؟''مفتی جی نے کہا ''وہ مدرسہ قادریہ کا طالب علم ہے، تمہیں پھانس رہا تھا، لفظ غلط ہے''۔ پھر ہم سے ملے تو

فرمایا ''بری بات ہے بزرگوں کا احترام کرتے ہیں''۔

مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ نے بے شمار کہا ہے لیکن طبیعت بے حد لاابالی قسم کی تھی، اس لئے سب کلام یقیناً محفوظ نہ ہوگا۔ نعت ومناقب کا زیادہ تر کلام مولوی نثار احمد قادری صاحب نعت خواں درگاہ قادری کے پاس محفوظ ہے، جس میں ہر موقعہ کے لئے کلام موجود ہے۔ آج بھی اس کی تازگی میں کوئی فرق نہیں۔ دو سال پہلے کی بات ہے، میں نے عرس قادری میں تازہ رخصتی پیش کی۔ اس کے بھی موجد بھیاولیؔ (مولوی ولی الدین چشتی قادری خلیفہ زادہ حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہما) اور مفتی لطفؔ ہی ہیں، جب رخصت کے بعد تبرکات کا جلوس مکان کے دروازے پر پہنچا تو مولوی نثار احمد صاحب نے رخصتی شروع کی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میں ابھی درگاہ قادری میں رخصتی پڑھ کر آرہا ہوں، یہ انھیں کہاں ملی، ذرا غور سے سنی تو محسوس ہوا کہ اسی زمین میں یہ دوسری رخصتی ہے۔ میں نے بیاض میں جھانکنا چاہا تو انھوں نے چھپالیا، مگر مقطع میں تو بہرحال لطفؔ موجود تھا۔

مولانا مفتی حسین احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ (برادر بزرگ حضرت مولانا فضل احمد قادری علیہ الرحمۃ کے بڑے صاحبزادے جو مفتی لطفؔ کے تھے تو بھتیجے گو بڑے بھائی کے جانشین ہونے کی بنا پر مفتی جی اور چچا بھی انھیں بڑے بھائی ہی کہتے تھے) نے دو دیوان (ایک بہاریہ اور ایک نعت و منقبت کا) مرتب کردیئے تھے، جن پر قبضہ کرنے کی میں سوچتا رہی رہا اور بیگم مزمل حسین (مفتی حسین احمد مرحوم کی صاحبزادی) لے اُڑیں۔ میری چھوٹی مفتیہ (مفتی مذکور کی پوتی) نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دیوان حفاظت سے رکھے گی اور نقل مجھے دے گی۔

مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ نے مشق سخن میں جو پاپڑ بیلے تھے، اپنے شاگردوں سے وہ اس کی توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لئے آسان ہدایات دیتے تھے کلام کی اصلاح سے زیادہ فکر کی اصلاح کا خیال رکھتے تھے۔ مثلاً شاگردی کی شرائط کے طور پر مجھے یہ ہدایتیں دیں کہ مصرع کاغذ پر نہیں لکھو گے دماغ میں شعر مکمل کرو گے۔ شعر مکمل ہو جانے پر سوچو گے کہ تمہارا کوئی ساتھی جو علم اور عمر میں تم جیسا ہے اس بات کو اسی طور پر کہہ سکتا ہے یا نہیں، اگر محسوس کرو فلاں بھی کہہ سکتا ہے تو اس شعر کو اس وقت تک اپنا نہ سمجھو گے جب تک مضمون یا طرز ادا میں ایسی ترمیم نہ کر لو کہ وہ

شعر تمہارا بن جائے۔

چچا (مولوی مفتی کرم احمد قادری میخوارؔ علیہ الرحمۃ) نے سنایا کہ مدرسہ قادریہ کی مسجد میں امامت پھوپا صاحب (مولانا حکیم سراج الحق قادری ابن مجاہد آزادی مولانا فیض احمد بدایونی) یا میاں حضرت (حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری) کیا کرتے تھے۔ جب یہ منصب مولانا صاحب (حضرت مولانا عبدالمقتدر مطیع الرسول قادری) کو ملا اور ان کی اقتدا میں سابق کے اماموں نے نماز ادا کی تو میاں حضرت (حضرت تاج الفحول مولانا عبدالقادر قادری) نے فرمایا ''مولانا امام الائمہ ہوگئے''۔ یہ روایت کان میں پڑی ہوئی تھی جب مفتی لطفؔ کے شاگردوں کے بھی شاگرد پیدا ہوگئے تو دل سے آواز آئی ''میرا استاذ استاذ الاساتذہ ہے''۔ جب سے ہی ہم مفتی لطفؔ علیہ الرحمۃ کو استاذ الاساتذہ کہنے لگے۔ اس میں ان کے ساتھ عقیدت کے علاوہ ممکن ہے جذبۂ خودستائی بھی کارفرما رہا ہو۔ بہرحال ہم میں جو استاذ بھی ہیں وہ استاذ الاساتذہ کی شاگردی کے طفیل میں ہی ہیں۔



عیداورعیدی

عیدخوشی ومسرت کی ایک لہر کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے حالانکہ اس کے معنیٰ لوٹنے کے ہیں،عوداس کا مادہ ہے، رجوع اس کے معنیٰ ہیں۔ بات یہ ہے کہ یوں تو ساری کائنات اوراس کی ہرآن وساعت مالک کے کرم کا مظہر ہے۔مگر بعض شہور وایام کوخصوصیت حاصل ہے اور وہ ممتاز ہیں، رجب شہراللہ ہےاس میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے متوجہ رہنا استغفار ذنوب میں مشغول رہنا دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں زیادہ پسندیدہ ہے۔شعبان کوآنحضورﷺ نے اپنا مہینہ فرمایاہے،اس میں درودوسلام کی کثرت رحمت وبرکات کےحصول کی ضامن ہے۔رمضان کوامت کامہینہ فرمایاہےیعنی اس میں مسلمان اپنے فرماں بردارہونے کاعملی ثبوت پیش کریں اور باوجوداستطاعت ان تمام اجازتوں سے پرہیز کریں جوانھیں حاصل ہیں رمضان میں مسلمان دنیا کودکھاتے ہیں کہ اسلام سب کے لیے مساوات کاعملی پیغام ہے،غنی ومفلس کی تفریق تعمیل حکم میں ممکن نہیں،اسلام نے جومعیاربرتری مقررکیاہےوہ صرف تقویٰ ہےان اکرمکم عنداللّٰہ اتقٰکم (اللہ کےنزدیک تم میں سب سےمکرم سب سےمتقی ہے)اوراس کےمظاہرہ کابہترین زمانہ ماہ صیام ہے۔منہ بند ہیں،نگاہیں جھکی ہیں،کان محفوظ ہیں،قرہ عینی فی الصلوٰۃ (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کا اہتمام ہے،افطارواسحار میں کلمات شکرلب پرجاری ہیں، دل انوارایمانی سےلبریزہیں۔

مسلسل تین مہینہ تزکیۂ نفس اورخشیت الٰہی سے دلوں کومجلّٰہ کرتے رہنے کاانعام ہلال شوال کی صورت میں جلوہ گرہوتا ہے۔قیدوبند کےامتحان میں پورے اترنے والوں کواجازت عام کی طرف لوٹنے اورنعم الٰہی سے متمتع ہونے کاموقع میسرآتاہےجس سےقلوب میں مسرت کی لہردوڑ

جاتی ہے، چہرے دمک اٹھتے ہیں، درو دیوار سجتے ہیں، بہترین لباس پہنے عطر میں بسے بسائے تکبیر کہتے ہوئے حکم کے بندے نماز شکرانہ ادا کرنے مصلیٰ کی طرف خوشیاں مناتے ہوئے مستانہ خرام ہوتے ہیں، یہی عید ہے۔

عید اور اس کی خوشیاں انعام الٰہی کی طرف لوٹنے کا نام ہے مگر یہ تمام نعمتیں جن سے متمتع ہونے کی ہمیں دنیا میں اجازت ہے، ان انعامات الٰہی کے مقابلہ میں دریا کا ایک قطرہ بھی نہیں جو مقربین بارگاہ کو عیش دوام میں دیئے جاتے ہیں۔ **ما تشتهيه الا نفس و تلذ الاعين** (جس کو جی چاہے اور آنکھیں پسند کریں) کا دائرہ کتنا وسیع ہے اس کا تصور بھی ادراک سے باہر ہے اور پھر ان سب سے بڑھ کر ''زیادۃ'' کا انعام خصوصی بھی ہے جس کی تعبیر و تشریح کیسے کی جائے جبکہ اس کی تفسیر میں اس جمال کا نظارہ بھی بیان کیا جاتا ہے جس کی شان یہ ہے کہ **لا تدركه الابصار** (نگاہیں اسے پا نہیں سکتیں)۔

علائق دنیوی سے منہ موڑ کر جب پاک روح منزل قرب کی طرف لوٹتی ہے تو اسے کتنی خوشی نہ ہوتی ہوگی کہ سب سے بڑا انعام پانے کا وقت آیا، اس لیے مرد مومن کے لیے حقیقی عید تو پیام موت ہے **يا ايتها النفس المطمئنة ارجعی الی ربک راضية مرضيه** (اے مطلق جاں اپنے رب کی طرف خوش بہ خوش لوٹ جا) واپسی کا یہ حکم کتنا روح افزا ہے اور جب کہ اسی کے ساتھ **فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی** (میرے بندوں اور میری جنت میں داخل ہوجا) کا فرمان بھی ہے جہاں عیش مُخلد اور بڑے بڑے انعامات اس کے لیے مہیا ہیں، اس مژدۂ جاں فزا کو سن کر جو خوشی میسر آتی ہے اس پر لاکھوں عیدیں قربان ہیں حکیم امت علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے کیا خوب کہا ہے ؎

نشانِ مرد مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم برلب اوست

ہم وابستگان در دولت سرائے قادری کے لیے ماہ شوال عید ہی عید ہے۔ ایک وہ عید جو ہر مسلمان کے لیے روزہ داری کے کامیاب انجام کا انعام ہے۔ دوسرے یہی وہ مبارک ماہ ہے جس کی گیارہ تاریخ کو ہمارے حضرت اقدس (عاشق الرسول عبدالقدیر بدایونی) قدس سرہٗ کے ظہور

سے جلوہ ہائے فضل رسول عیاں ہوئے جس کی بشارت اٹھائیس سال پہلے دی جا چکی تھی۔۱۲۸۳ھ جمادی الاخری کی ۱۱؍تاریخ حضرت تاج الفحول عبدالقادر محبّ رسول فقیر قادری قدس سرہٗ کا کاشانہ صاحب اقتدار کی جلوہ باری سے جگمگا اٹھا، حضور سیف اللہ المسلول معین الحق فضل رسول قادری قدس سرہٗ کی خدمت میں نومولود کی خوشخبری پیش کی گئی، انھوں نے دو تعویذ عطا فرمائے اور فرمایا ایک ان صاحبزادہ کے گلے میں ڈال دو، ان کا نام عبدالمقتدر مطیع الرسول قادری رکھو۔تاریخی نام غلام پیر تجویز ہوا پھر فرمایا دوسرا تعویذ محفوظ رکھو دوسرا لڑکا پیدا ہو تو اس کے گلے میں ڈال دینا، ان کا نام عبدالقدیر عاشق الرسول قادری ہوگا۔

۱۱؍شوال المکرّم ۱۳۱۱ھ کو ۱۲۸۳ھ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور حضرت اقدس و اعلیٰ رونق فزائے عالم ظاہری ہوئی، یہ دہری عید ہے کہ ہمارے تیرہ دلوں کو عشق کے سوز نورانی سے اجالنے والا اسی عید کے مہینہ میں تشریف لایا۔

یہ تو ہوئی سب کی عید اور ہم وابستگان دامن کی عید، اس سے بڑھ کر عید خود ان کی عید ہے، حضرت اقدس و اعلیٰ قدس سرہٗ کے دیدار سے جو آنکھیں مشرف ہوئیں ہیں وہ گواہ ہیں کہ درون سینہ سوز عشق رکھنے والا ہمیشہ سراپا حسن نظر آیا ہے، لطف بیکراں نے ہر طرف پھول بکھیرے ہیں، ان کی شخصیت کے گل وگلزار ہونے کا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا ہے جنھیں حسن عقیدت سے حصہ نہیں ملا، غرضکہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

کی کامل جلوہ گری کا مشاہدہ سب نے کیا ہے۔حتیٰ کہ بیماری کی تکلیف میں بھی ان کی ادائے تبسم مضطرب قلوب کی ڈھارس بندھاتی رہی۔

یہ گدائے خاک نشیں دکن دیس میں رہتا ہے، بظاہر سیکڑوں میل دور لیکن الحمدللہ تو جہات سے قرین رہا ہے، عرس قادری میں حاضری کا حکم پہلے ہی آجاتا اور درگاہ قادری میں نغمہ سرائی کی عزت بخشی جاتی اور جب بعد عرس قادری واپسی کے لیے قدمبوس ہوتا تو فرمایا جاتا ’’کمزوری بڑھ رہی ہے اللہ کا شکر ہے تمہیں دیکھ لیا نہ معلوم پھر یہ موقعہ ملے یا نہ ملے‘‘، بظاہر یہ کلمات زندگی سے

ناامیدی ظاہر کرتے تھے مگر جب چہرے پر نگاہ پڑتی تھی تو اس جاں فزا تبسم کو دیکھتے ہی عرض کرتا تھا ''ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا، ابھی آپ کو کچھ نہیں ہونے کا، مسکراتے ہوئے فرماتے ''تمہیں غیب کا علم ہے؟'' عرض کرتا ''وہ تو نہیں ہے مگر حضرت تاج الفحول قدس سرہ نے آپ کے لیے جو دعائیں اور التجائیں سرکار قادریت میں کی ہیں دل ان کے قبول کیے جانے کا یقین رکھتا ہے''۔

یہ سلسلہ بھی برسوں جاری رہا، یہاں تک کہ میں نے خواب دیکھا کہ مدرسہ قادریہ میں مدینہ شریف کا جو نخل ہے وہ کٹا ہوا دالان میں پڑا ہے جہاں حضرت اقدس قدس سرۂ تشریف رکھتے تھے، خواب میں ہی میں اپنی عادت کے مطابق غصہ کرنے لگا کہ یہ کس نے کیا، سامنے سے مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور فرمایا فلاں نے یہ درخت کٹوا ڈالا، آنکھ کھلی تو دل بے چین تھا فوراً یہ خواب لکھ کر تعبیر طلب کی جس کا جواب نہ ملا، والا نامہ آیا تو یہ ''بعد عید میں بغداد چلا جاؤں گا تم تیار رہو'' یہ اشارہ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔

رمضان کی آخری تاریخ تھی، فجر کے بعد میں سو رہا تھا۔ کالج کی چھٹی تھی کہ حضرت شیخ سیدنا و مولانا عبدالحمید محمد سالم قادری دامت برکاتہم کا تار آیا ''باوا خطرے میں ہیں فوراً پہنچو'' اس کے بعد دل کا کیا حال ہوا، عید کا چاند دیکھنے کا ہوش کسے تھا، چل پڑا۔ متھرا سے ریل چھوڑ کر بس سے بھاگا اور قدمبوس ہوا، آنکھیں کھول کر دیکھا رخسار پر شفقت سے ہاتھ پھیرا، نامکمل جملے میں خیریت پوچھی میں نے اطمینان دلایا اور اجازت لے کر درگاہ قادری میں حاضری دے کر پھر قدموں میں آ بیٹھا۔

شرم رکھ لی مری میرے اللہ نے　　　　ہاتھ دامانِ عبدالقدیر آ گیا

بعد عشا حضرت تاج الفحول قدس سرہ کے دواوین منقبت سنانے بیٹھا، حضرت اقدس کی آنکھیں اشک بار رہیں مگر زبان سے کچھ نہیں کہا، سب سو گئے میں خدمت میں حاضر رہا جی چاہا کچھ عرض کروں مگر دیکھا کہ حضرت اقدس نے کروٹ لے لی ہے سانس سے بالکل تندرست آدمی کے سونے کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، اس لیے ادب سے بیٹھا رہا فجر پڑھ کر سلام کو حاضر ہوا تو دیکھا مرتعش ہاتھ اُٹھا کر انگشت شہادت لبوں پر رکھی پھر کان پر لے گئے، میں جان گیا فرض کے بعد

حصار قادری کا معمول پورا فرمار ہے ہیں۔

بجز اس کے کہ گفتگو نہیں فرمار ہے تھے، ہوش وحواس میں اختلال کا کسی قسم کے شائبہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا، غذا دوا کے لیے کہا جائے تو اسے استعمال کر لیتے تھے، ہر ایک کی آواز سنتے تھے پہچانتے تھے مگر نہ معلوم کیا کیفیات تھیں کہ گفتگو بند کر دی تھی، ایک تو اس وقت جب کہ میں پہنچ کر قدم بوس ہوا خود سے آنکھیں کھول کر دیکھا اور خیریت پوچھی یا پھر ۳؍شوال کو جس وقت سول سرجن ڈاکٹر خاں صاحب آئے انھوں نے معائنہ کیا اور پوچھا ''مولانا صاحب کیا تکلیف ہے؟'' تو اس کے جواب میں ایک لمبی سانس کھینچی اور ''یا معبود'' فرمایا اور یہی آخری لفظ تھا جو خدام نے حضرت اقدس سے سنا۔

سب جانتے ہیں کہ تندرستی یا بیماری کسی حالت میں چہرے سے کسی قسم کی تکلیف کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا لیکن آج جو کیفیت نمایاں تھی اس میں کرب ہی کرب تھا، رنگ متغیر ہو ہو جاتا، وہ کیفیت نگاہوں کے سامنے تھی جس کی طرف حضرت تاج الفحول قدس سرہٗ نے اشارہ فرمادیا تھا:

بہت بے چین ہے مضطر ہے طائر روح عاشق کا
ہے اس کو رند پر آشوب اب مثلِ قفس یا غوث

وقت موعود قریب آ گیا اور جیسا کہ قاعدہ ہے ؎

موعد وصل چوں شود نزدیک   آتش شوق تیز تر گردد

روح پرنور پر فرقت کا ایک ایک پل گراں تھا، رفیق اعلیٰ کے قرب کے لیے سوز دروں بڑھتا جاتا تھا، شوق کی گرمی میں پیشانی سے عرق رواں تھا، یہ گدائے خاک نشیں پٹی پکڑے زمین پر بیٹھا تھا، حضرت شیخ دامت برکاتہم میرے پاس استادہ تھے، ان کے پیچھے حضرت اماں جان صاحبہ مدظلہا کھڑی تھیں، حضرت اقدس قدس سرہ نے آنکھیں کھولیں بھر پور نگاہیں مجھ پر ڈالیں، ایک لفظ بھی فرمایا نہیں مگر میں سمجھ گیا کہ آخری سنت ادا فرمانا چاہتے ہیں میں نے پلٹ کر محترمہ اماں جان صاحبہ سے عرض کیا باوا کی مسواک کہاں ہے؟ انھوں نے اپنے دانتوں میں دبا کر مجھے دیا اور میں نے حضرت اقدس قدس سرہ کے دانتوں میں مسواک کی۔

مسواک کے جوفوائد بیان کیے جاتے ہیں ان میں نزع کی تکلیف میں کمی بھی ہے چنانچہ آنحضرت روحی لہ الفدا ﷺ نے قریب وصل رفیق اعلیٰ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مسواک طلب کی تھی اور انھوں نے اسے اپنے دانتوں سے نرم کر کے دیا تھا یہ سنت بھی ادا ہوگئی۔

میں ذرا ضروریات سے فارغ ہونے اور تازہ وضو کرنے کے لیے کمرہ سے باہر نکلا ہی تھا کہ کسی نے پکارا ''ارے مولانا اٹھ کر بیٹھ گئے''۔فوراً پلٹ کر آیا تو دیکھا حضرت اقدس قدس سرہ بیٹھے ہوئے ہیں، دونوں ہاتھ آداب کے انداز میں اٹھے ہوئے ہیں اور گردن تسلیم ادا کر رہی ہے فوراً پشت کو سہارا دیا تو سلام کرتے ہوئے چہرہ تک بلند فرما کر گردن اٹھائی، میں نے آہستگی سے سہارا دے کر لٹا دیا، دل نے محسوس کیا اب رکنے کا کوئی سوال نہیں ہے، بلانے والے لینے تشریف لے آئے اور انھوں نے نیاز تسلیم ادا کر لیا میں جلدی سے تازہ وضو کر کے پھر پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گیا۔

حضرت شیخ دامت برکاتہم جو ابھی تک میرے پاس ہی اسی جانب تھے سیدھے بازو میرے مقابل تشریف لے آئے، انھوں نے ذکر شروع کر دیا، یہ گدائے خاک نشیں بھی ذکر میں شامل ہو گیا، اب ہم دونوں کے چہرے حضرت اقدس قدس سرہٗ کے رخ پر نور سے تقریباً ملے ہوئے تھے، ذکر اسم ذات اور صلوات علی النبی دونوں کو ہم نے ملا لیا تھا کہ اچانک میری آنکھیں بند ہوگئیں، نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی کا ایک جھماکہ ہوا، یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ روشنی باہر سے آ کر ان کے سینہ میں داخل ہوگئی یا سینہ سے نکل کر بلندیوں پر پرواز کر گئی۔

پلک جھپکتے میں حسن وعشق گلے مل گئے، فراق وصل ابدی میں تبدیل ہو گیا جو چہرے پر نگاہ پڑی تو وہ چہرہ ہی نہیں تھا جسے ہم نے ساری عمر دیکھا تھا یا جسے ابھی ابھی الم فراق میں دم بدم متغیر دیکھ رہے تھے، بے اختیار میری زبان سے نکلا ''ماں آپ نے کچھ دیکھا یہ وہ نہیں ہیں جنھیں ہم دیکھ رہے تھے''، چہرے سے نور پھوٹتا محسوس ہوتا تھا جس سے میں نکلتے ہوئے بدر کامل کی تشبیہ دوں تو ایک حد تک تصور قائم ہو جائے گا مگر جو میں نے دیکھا وہ تو کچھ اور ہی تھا، مسرت وانبساط

خاطر کے جو تاثرات ہر شخص کو نظر آتے تھے، ان کے متعلق میں بغیر مبالغہ کے کہہ سکتا ہوں کہ ساری عمر اس چہرے کو مسکراتا دیکھا ہے مگر جس قسم کی مسکراہٹ ایک لمحہ میں مرتسم ہوگئی تھی ویسی شاید حیات ظاہری میں ممکن ہی نہ تھی کیونکہ زندگی کی ساری مسرتیں وہ خوشی دے ہی نہیں سکتیں جو عاشق کو لذت وصل اور وہ بھی وصل الابدی میں میسر آسکتی ہے، دیکھتے ہی محسوس ہوتا تھا یہ ان کی عید ہے، سب سے بڑی عید۔

اس طرح ہمارے لیے اس ماہ شوال المکرّم میں تین عیدیں جمع ہوگئیں، سب کی عید (عید الفطر) ہماری عید (عید ولادت) اور ان کی عید (عید وصال)، رہی عیدی تو وہ ایک رسم ہے مگر بے حد فطری، چھوٹے سلام کرتے انعام پاتے ہیں، بڑے انعام دیتے ہیں اور شفقت کرتے ہیں کیونکہ جب دل خوش ہوں تو سب کو خوشیاں ہی خوشیاں ملتی ہیں۔

مقربان بارگاہ کے یوم وصال پر جو اعراس منعقد ہوتے رہیں وہ حقیقت میں ان کی عید وصل کا جشن ہوتا ہے، یہ ان کی خوشی کی ساعتیں ہیں، ہم جو ان میں حاضری دیتے اور عرض معروض کرتے ہیں وہ ان کی عید کا سلام ہے اور جو برکات پاتے ہیں وہ عیدی ہے۔



رغم الانف

(ڈاکٹر محمد مسعود احمد نقشبندی کے ایک کتابچہ کا تنقیدی جائزہ)

ہوالمقتدر

جناب ''پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہٗ'' صاحب مجدکم اللہ تعالیٰ سلامتی، رحمت اور برکات

کئی روز ہوئے مدراس سے کسی S.T.Ali صاحب نے ایک ملفوف میرے نام اور پتہ پر بھیجا، بہت دیر تک تو ذہن پر زور ڈالتا رہا کہ مدراس میں میرا نام پتہ جاننے والے یہ کون صاحب ہیں؟ تھک گیا تو اس سے قطع نظر کی اور لفافہ چاک کیا، اندر سے ایک پرچہ تہور علی نقوی صاحب کا ایک خط جناب کا اور ایک کتابچہ ملے، ایصال ودیعت پر نقوی صاحب کا شکریہ۔

اب آیے اس غلط فہمی کی طرف کہ میں نے آپ کے خط کا جواب نہیں دیا۔ خط ملا ہی نہیں، جواب کس کا دیتا؟ رہا یہ امر کہ پروفیسر محمد اسحٰق قریشی صاحب نے بھی خط لکھا تھا وہ بھی جواب کے منتظر ہیں تو عرض ہے کہ ان کا خط مل گیا تھا مگر ڈاکٹریٹ وہ کر رہے ہیں، میں نہیں، ان کو جوتیاں گھسنی چاہئیں، بنا بنایا نوالہ نگلنے کی عادت خراب ہے، بدہضمی ہو جائے گی۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ بوڑھا ہو گیا ہوں، زبردستی کے کام کرنے کی ہمت نہیں، ورنہ میں تو ان میں تھا کہ امتحان گاہ میں بھی کسی تلمیذ کا قلم رکتے دیکھتا اور آموختہ سنا دیتا، پھر زبردستی ڈانٹتا کہ ''نالائق مجھے امتحان نہیں دینا مگر یاد ہے، تجھے امتحان دینا تھا مگر یاد نہیں، بدبخت اب تو لکھ''۔ موصوف سے تو صرف معذرت کرنی تھی، سوچا تھوڑا ناراض ہوں گے پھر بھول جائیں گے تو میں خامہ فرسائی کیوں کروں۔

غالباً خط کا جواب تو ضرورت سے زیادہ ہو گیا۔

اس سے پہلے کہ کتابچہ پر نگاہ ڈالوں یہ بتاتا چلوں کہ صاحب تذکرہ عاشق الرسول محمد عبدالقدیر قادری بدایونی قدس سرہ کا درمیان میں ذکر آئے گا تو ان کے لیے ''المولوی'' استعمال کروں گا کیونکہ ان کے برادر بزرگ اور پیر طریقت قدس سرہ نے انھیں ''مولوی صاحب'' سے ہی مخاطب کیا اور ان کے تتبع میں سبھی نے یہی کہا، پھر میں نے دیکھا کہ ہندوستان کے باہر بھی انھیں المولوی ہی کہا جاتا۔ بصرہ پر جہاز لنگر انداز ہو رہا ہے، المولوی سامنے کھڑے ہیں، جہاز ٹھہرا ہی ہے کہ ساحل پر کھڑے ہوئے سامان اتارنے والے قلیوں کی نگاہ پڑی اور انھوں نے بیک آواز نعرہ لگایا جاء المولوی (مولوی آگئے)۔

بغداد میں گیلانی خاندان کے تمام بزرگ وخورد افراد المولوی سے ہی مخاطب کرتے۔ عراق کے ایک باوقار علمی خاندان ''الواعظ'' کے تمام افراد المولوی ہی کہتے۔ عراق کے مفتیٔ اعظم السید یوسف آل عطا رحمۃ اللہ علیہ اور امام اعظم کے مدرسہ کلیۃ الحقوق کے رئیس نعمان الاعظمی کو بھی المولوی کہتے سنا۔ مسقط کے وزیر اعظم (سابق) سلمان الدروبی بھی المولوی ہی کہتے۔

عراق کے شاہی ہاشمی خاندان کے افراد بھی المولوی ہی کہتے، صاحب الجلالۃ فیصل الاول (ملک العراق) ان کے بڑے بھائی السید علی بن حسین (ملک الحجاز سالفا) صاحب الجلالۃ غازی الاول (ملک العراق) عبدالالہ بن علی بن حسن (الوصی علی عرش العراق) کو بھی المولوی سے ہی مخاطب کرتے سنا۔ دمشق کے بڑے عالم السید عبدالقادر الاسکندرانی (مدرس الجامع الاموی) کو بھی یہی کہتے سنا، پھر القدس الشریف میں السید امین الحسینی (مفتیٔ اعظم فلسطین) دیگر علمائے قدس اور زعمائے فلسطین کو بھی المولوی سے ہی مخاطب کرتے دیکھا۔ المغرب الاقصی کے زعیم السید عبدالعزیز الثعالبی کو یہی کہتے سنا۔ مدینہ منورہ کے بڑے محدث الشیخ خضر الشنقیطی المغربی کو بھی المولوی کہتے پایا۔

یہ محرر سطور خود اپنے لیے خادم استعمال کرے گا کہ یہی اس کا فخر ہے۔

ہاں تو آؤ اب کتابچہ کی سیر کریں۔

ٹائٹل پر ہی صاحب تذکرہ المولوی کا لقب ''عاشق الرسول'' بخط عربی لکھا ہے اور اس پر صلی اللہ علیہ وسلم بھی لکھا ہے۔

بتاؤ قواعد سے کچھ واقف ہو؟ خیر خادم سمجھانے کی کوشش کرے گا۔

ترکیب اضافی میں اصل تو مضاف ہوتا ہے، نسبت کی وضاحت کے لیے مضاف الیہ لاتے ہیں، پھر مرکب اضافی دونوں اجزا سے مل کر ایک کل بن جاتا ہے، یہاں صلاۃ وسلام کا مرجع عاشق قرار پاتا ہے جو غالباً جناب کا مقصد نہیں ہوگا۔

یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کسی شخص کا نام عبداللہ رکھا جائے اور وہ عبداللہ جلّ جلالہ لکھے۔ وہ لکھے یا جناب لکھیں کیا فرق پڑتا ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ''اللہ اکبر جل جلالہ'' سے 'ملا عبدالقادر' نے کیوں گریز کیا اور گھر گھر پناہ ڈھونڈتا پھرا۔

تذکرہ نگار کے نام ''پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مدظلہ'' پر تعجب ہوا، مگر اندرونی ٹائٹل کی پشت پر ناشر کوئی ''مولانا سلّمہٗ'' مل گئے، ان سے کہنا بے کار ہے کہ عہدہ اور سند دونوں ایک ساتھ نہیں لکھتے، وہ مولانا ہیں تو سارے قواعد ہیچ ہیں اور ناشر ہوتے ہوئے خود اپنے نام سے پہلے مولانا لکھ سکتے ہیں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اب انتساب تک پہنچے، اس کے متعلق بعد میں کچھ عرض کروں گا۔

اب ''اظہار تشکر'' پر نگاہ ہے، یہ عنوان کچھ عجیب سا لگا، تشکر ایک قلبی احساس ہے، لازم خود ہوتا ہے اظہار کا اس سے کیا تعلق؟ ہاں ایک صورت سے بات بن سکتی ہے، تفعل کی ایک خصوصیت تصنع بھی ہے جب شکر مصنوعی ہو تو دکھاوے کے لیے ہو سکتا ہے اور اظہار تشکر سے احباب کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے مگر یہ جناب کا اور احباب کا معاملہ ہے، خیر ہوگا۔

اس ضمن میں جو اسمائے گرامی ہیں ان میں سے صرف دو کو پہچانتا ہوں اور ایک سے جان پہچان نہ ہوتے ہوئے نسبت محسوس کرتا ہوں۔

(ا) پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب سلّمہٗ – ان سے خادم کو پہلے سے ہی شکایت ہے کہ انھوں

نے اپنی مطبوعات میں اضافہ کی خاطر میرے نانا رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب (۱) ایسے لوگوں کے حوالے کر دی جنھوں نے بے سروپا حواشی سے کتاب کو مسخ کر دیا، بعد میں آنے والے تو یہی سمجھ لیں گے کہ یہ سب غلام شبر قادری کے رشحات قلم ہیں اس لیے قابل اعتبار، حالانکہ اصل کتاب سے حواشی کا کوئی تعلق نہیں، یہ سب ''می پرانند'' کی اپج ہے۔ کتاب کا نام طغرا میں تھا، اسے پڑھنے میں دشواری ہوئی ہوگی، مغزپاشی سے بچنے کے لیے الٹ پلٹ دیا کتاب کا یہ دوسرا حصہ بھی پہلے سے مطبوعہ ہے۔ ہاں بطور مقدمہ مذاقی فتنے کی تاریخ مجھے بھائی، اسے محفوظ ہونا چاہیے تھا، آگے آنے والوں کے لیے مفید ہوگی۔

(۲) جناب عبدالمجید محمد اقبال صاحب سلّمہٗ- یہ تو جان برادر ہیں، مگر جہد آزادی کے بہت بعد پیدا ہوئے، اس دور کی معلومات ان کے پاس بہت ہی کم ہوں گی۔

(۳) حکیم نصیر الدین اجمیری صاحب سلّمہٗ- ان سے نیاز حاصل نہیں مگر ان کے عم محترم اور المولوی استاذ بھائی تھے، پھر خادم نے علامہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ القول الاظہر پڑھا ہے جو انھوں نے مسئلہ اذان خطبہ میں نہایت عالمانہ اور محققانہ تحریر فرمایا ہے۔

باقی حضرات خادم کے لیے غیر متعلق ہیں۔

اب فہرست نظر کے سامنے ہے۔

''افتتاحیہ''، انشاءاللہ ضرور پڑھوں گا۔

(۱) مولانا فضل الرسول بدایونی قدس سرہٗ- سیف اللہ المسلول اور استاذ مطلق خیرآبادی (رحمۃ اللہ علیہما) باہم یگانگت رکھتے تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا نقشہ دونوں نے مل کر بنایا تھا (خاندانی روایت)۔ مگر اس میں بے ترتیبی نے پانسہ پلٹ دیا اور استاذ مطلق کو جلاوطن کیا گیا ؎

مار دیا یارِ غیر میں ان کو وطن سے دور

(غالبؔ سے معذرت کے ساتھ)

۱۔ مولانا غلام شبر قادری بدایونی کی کتاب ''مدائح حضور نور'' کا دوسرا حصہ ایوب قادری صاحب کے مقدمہ کے ساتھ ''تذکرۂ نوری'' کے نام سے سنی دارالاشاعت لائل پور (پاکستان) سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ کتاب کا نام ''مدائحِ حضورِ نور'' تھا لیکن ڈاکٹر ایوب قادری صاحب نے اس کو ''نور مدائحِ حضور'' سمجھا، اور مقدمہ میں جگہ جگہ یہی لکھا، اسی کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) مولانا فیض احمد بدایونی قدس سرہٗ - حضرت رسوا جہاد آزادی میں عملی طور پر شریک ہوئے، مختلف محاذوں پر نبرد آزما رہے، پھر لا پتہ ہو گئے، حضرت تاج الفحول قدس سرہٗ ان کا فاتحہ اپنے کشف کی بنا پر فرماتے تھے۔

(۳) محبّ رسول مولانا محمد عبدالقادر بدایونی قدس سرہٗ - حضرت تاج الفحول قدس سرہ بظاہر انگریز سے نبرد آزما نظر نہیں آتے مگر خادم جناب کو بتائے کہ وہابیوں کا ردصرف خرابی عقیدہ کی بنا پر نہ تھا، اس میں انگریز دشمنی بھی شامل تھی۔

وہابی تحریک کے مرشد سید احمد رائے بریلوی پر ایک محققانہ رسالہ شیخو پور (بدایوں) کے رئیس، فریدی صاحبزادے، نقیب کے مدیر اور اپنے وقت کے ادیب شہیر جناب وحید احمد مسعود فریدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، اگر ممکن ہو تو ضرور پڑھنا چاہیے اس رسالہ میں یہ ثبوت فراہم کیا گیا ہے کہ وہابی تحریک انگریز کے خلاف نہیں تھی، بلکہ اسے برطانوی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔

ان حضرات کا تذکرہ غالباً تسلسل روایت اور المولوی میں اس کی جلوہ گری کے لیے کیا گیا ہوگا، مگر ان تین بزرگوں کے اسما کے بعد چوتھا نام غلام پیر مطیع الرسول عبدالمقتدر قادری قدس سرہٗ کا ہونا ضروری تھا، کیونکہ المولوی کی شخصیت اور کردار بنانے میں انھیں کا فیض کارفرما ہے۔

سرکار مقتدر قدس سرہٗ المولوی کے نہ صرف برادر بزرگ تھے، مربی تھے، استاذ تھے اور شیخ طریقت تھے، المولوی میں سب انھیں کی جلوہ گری ہے۔ تفصیل میں جاؤں تو لکھتے لکھتے تھک جاؤں گا اور حق ادا نہ ہو سکے گا۔

(۴) عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی اور امام احمد رضا قدس سرہ۔ تعجب ہے کہ المولوی کے ساتھ اس نام نے کیسے جگہ پائی۔ اس کی بجائے یہ نام ہونا چاہیے تھے: باری میاں قدس سرہٗ (حضرت قیام الدین عبدالباری انصاری فرنگی محلی) حضور میاں قدس سرہٗ (حضرت سید شاہ مصباح الحسن مودودی، چشتی، امیر الجہاد، خلف الصدق حضرت سید شاہ عبدالصمد مودودی چشتی قدس سرہٗ صدر اہل سنت) مولانا حسرت موہانی، علی برادران، سیف الدین کچلو، مولانا سجاد بہاری (امارت شریعت) اور نواب اسمٰعیل خاں اور بال گنگا دھر تلک، گاندھی، آروند وگھوش، موتی

لال نہرو، ماسٹر تارا سنگھ اور المولوی کے تربیت کردہ جاں بازوں میں بسمل، برادرم اشفاق اللہ خاں شہید اور ان کے ساتھیوں کے نام بھی ضروری تھے، خیر مضمون پڑھوں گا ہی۔

(۵) عاشق الرسول مولانا محمد عبدالقدیر بدایونی قدس سرہٗ – یہ تو صاحب تذکرہ ہی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جناب کے احباب کی فہرست میں اگر محقق طوسی بھی شامل ہوں تو ان کے بارے میں آخر لکھ کیا سکیں گے؟ جناب نے خادم سے کوئی ربط قائم نہیں کیا، نہ مسودہ دکھایا کہ تصحیح اور ترمیم کر دی جاتی اور کتابچہ معتبر ہو جاتا۔ جناب کو معلوم ہونا چاہیے کہ المولوی سے خادم کو جو قرب و اتصال حاصل ہے وہ خادم ہی کا حصہ ہے۔ المولوی خادم کے والد تو ہیں ہی، استاذ ہیں، پیر کے جانشین ہیں اور جب خادم نے حضرت شیخ سالم قادری دامت برکاتہم کے ہاتھ پر بیعت کی تجدید کری تو دادا پیر بھی ہو گئے۔

نسبتیں ہو گئیں محقق چار

خادم جہدآزادی کے شباب کے زمانے میں بہت چھوٹا تھا مگر رضا کار کی وردی میں سبز نیام کی تلوار باندھے شہ نشین پر موجود رہتا۔ بریلی میں ملا جلا اجلاس مولانا آزاد کی صدارت میں ہوا تھا، بعد مغرب کارروائی شروع ہوئی اور خادم صدر جلسہ کے آگے تلوار باندھے کھڑا ہو گیا تو مولانا آزاد نے خطیب الہند حضرت ابوالمنظور مولانا عبدالماجد قادری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا یہ بچہ کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا مولوی صاحب کا بچہ محمد ہے، مولانا نے ہاتھ بڑھا کر کھینچ لیا، گود میں بٹھا لیا، غالباً ان کی گود میں ہی سو گیا، صبح آنکھ کھلی تو قیام گاہ پر تھا، تعجب ہوا کہ جلسہ میں ڈیوٹی پر تھا یہاں کیسے پہنچا؟

یہ ایک واقعہ صرف اس لیے بیان کیا کہ جناب المولوی کا تذکرہ مجاہد آزادی کی حیثیت سے کر رہے ہیں تو خادم اس میدان میں بھی ساتھ تھا مگر شاید جناب حقائق معلوم کرنا ضروری نہیں سمجھتے، سوچنا تو چاہیے تھا۔

ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

۶/۷/۸/ بھی پڑھوں گا۔

(۹) عاشق الرسول اور ڈاکٹر محمد اقبال- سر اقبال عملی آدمی نہیں تھے، تحریک آزادی کی پراگندگی کے دور میں مسلم کانفرنس کے جلسوں میں نظر آئے جس کے سربراہ شفیع داؤدی اور نیرنگ تھے اور کہیں نظر نہیں آئے، مفکر تھے، سارے جہاں کا درد دل میں لیے شعر کہتے رہے۔

المولوی نے بھی مسلم کانفرنس کے جلسوں میں شرکت کی، المولوی اور اقبال میں ادب، علم اور مسلک قادری قدر مشترک ہیں، اس لیے دونوں کے تعلق پر تعجب ہونا نہ چاہیے۔

(۱۰) کتابیات- دیکھنا ہے کہ کس کتاب سے کیا مواد حاصل ہوسکتا ہے۔

فہرست ختم ہوئی، بسم اللہ صفحہ پلٹتا ہوں-

ارے یہ کیا؟ کہاں تو یہ جوش عقیدت کہ عاشق کے لیے ﷺ بے دریغ لکھا اور کہاں یہ بے توجہی کہ شروع میں اللہ کا نام ہی غائب، کہیں یہ تحریر ''ابتر'' نہ ہوجائے، وعید تو ایسی ہی ہے۔

افتتاحیہ میں زیر عنوان اقبال کے اشعار ہیں۔ اقبال کے ادبی مقام اور فکر بلند سے کون انکار کرسکتا ہے، خود قرآن نے امم سابقہ کے عروج وزوال کی داستانیں اسی لیے دہرائی ہیں کہ ان سے بصیرت وعبرت حاصل ہو۔

اصل مضمون شروع ہوتا ہے، ایک طبقہ میں علما سے متعلق جو خیال پایا جاتا ہے اسے جناب نے انگریزی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والا خیال کہا ہے (ملخصاً)، خادم کے خیال میں یہ درست نہیں ہے کیونکہ انگریزی حکومت تو علما کو بے حد خطرناک اور نہایت کارآمد سمجھتی تھی، جس کا ثبوت علما کو قید و بند کے مصائب میں مبتلا کرنا اور جلا وطن کرنا ہیں اور جنھوں نے تحریک ترک موالات کے خلاف کام کیا یا جنھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر گھر کے بھیدی کا کردار ادا کیا وہ حکومت کی نگاہ میں یقیناً کارآمد تھے۔

علیحدگی پسندوں کی مثال دے چکا ہوں اس سے آگے بڑھنے والوں سے متعلق معلوم کرنے کے لیے ہمدرد (دہلی) میں مولانا محمد علی جوہر کا طویل مسلسل مضمون ''ختم خواجگی'' پڑھیے ہمدرد کا فائل ضرور مل جائے گا۔

صفحہ ۷- درست کہ علما نے حاکموں کی رہنمائی کی...... ''خود پاک و ہند کی تاریخ اس حقیقت پر گواہ

ہے''۔ تاریخ کی گواہی میں ''پاک'' کا لفظ شامل کرنا خادم کی سمجھ میں نہیں آیا، یہ نوزائیدہ مملکت ابھی تاریخ نہیں بنا سکی، اس انتشار میں علما نے کیا کیا اور اسلامی احساس کو کہاں تک عام کیا، یہ تو مستقبل کا مؤرخ ہی بتا سکے گا۔ فی الحال تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی پوچھ بیٹھے کہ ؎

تجھ میں کیا بات تیرے نام سی ہے

تو جواب بن نہ پڑے۔

اسی صفحہ ۷؍ پر عہد جہانگیری و عالمگیری میں جناب نے بڑے طمطراق سے اسلامی انقلاب کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ (اسلامی انقلاب) تو خوبصورت ہے مگر اس انقلاب کا عملی دخل عہد راشدین کے بعد خادم کو تو کہیں نظر نہیں آیا، مسلمانوں نے اپنی فتوحات سے دنیا کو زیروزبر کر دیا مگر اقتدار پر قابض ہونے کے بعد کہیں بھی اسلامی انقلاب برپا نہیں ہوا، کسی نے بھی یہ نہیں کہا ؎

بادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں

خطبۃ الوداع اسلامی انقلاب کا منشور ہے بنیادی بات ''کلکم من آدم و آدم من تراب'' سے جو مساوات اور فروتنی پیدا کرنا اسلامی انقلاب کا خاصہ ہے وہ کہیں نظر نہیں آتی، اگر نظر آئی ہو تو بتایے۔ افراد کی مثال نہ دیجیے، اجتماع کی بات کیجیے کیونکہ انقلاب کا عمل عمومی ہوتا ہے۔

اسی صفحہ ۷؍ پر جناب نے امراؤ سلاطین کا کردار خود ہی لکھا ہے، کوئی عیب ایسا نہ ہوگا جس کی نشاندہی نہ کی ہو، پھر وہ انقلاب کہاں گیا جس کا جناب نے دو بادشاہوں کے عہد میں ذکر کیا ہے۔

صفحہ ۸؍ علما کی اہلیتِ جہاں بانی کے سلسلہ میں جناب نے کسی گدڑی پوش کا ذکر کیا ہے۔ اس سے جناب کی مراد ذات سرکار رسالت ﷺ سے ہے، یا راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے کسی کی طرف اشارہ ہے تو نہایت بیجا کی ہے۔ خادم کے سید و مولا سرکار بغداد رضی اللہ عنہ و رحمۃ اللہ علیہ تو خود اپنے لیے فرماتے ہیں کہ صاحب رسول جس گھوڑے پر سوار ہو اس کے سم کے نیچے جو خاک آئے عبدالقادر (رضی اللہ عنہ) اس کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔

اسی صفحہ ۸؍ پر افتتاحیہ (۲) کی تیسری سطر میں ہے ''خود شاہ وقت ان سے استفتا لیا کرتا تھا''، اس سطر نے خادم طالب علم کو اپنی طرف کھینچ لیا، عربی الفاظ کی کچھ معنوی خصوصیات ہوتی ہیں ان کا

علم نہ ہوتو انھیں استعمال نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

ایک مثال سے سمجھیے ،ایک لفظ فائدہ ہے، اردو میں بھی رائج ہے۔اس لفظ سے افادہ بنتا ہے تو اس کے معنی دوسرے کو فائدہ پہنچانا ہو جاتے ہیں اور اسی فائدے سے استفادہ بنتا ہے تو معنی دوسرے سے فائدہ حاصل کرنا ہوتے ہیں۔عربی قواعد کی کتابوں میں خاصیات ابواب مستقل عنوان ہے۔

''استفتا'' (باب استفعال سے ہے جس میں طلب کے خصوصی معنی پیدا ہوتے ہیں) کے معنی فتویٰ حاصل کرنا ہیں، اس کاغذ کو بھی کہتے ہیں جس پر سائل صورت مسئولہ لکھ کر کسی مفتی کے سامنے پیش کرتا ہے اور فتوی چاہتا ہے۔

جناب کی عبارت کے معنی یہ ہوئے کہ علما کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تو وہ استفتا لکھتے اور شاہ وقت کو پیش کرتے کہ وہ (بادشاہ) بڑا مفتی ہے تا کہ وہ اس پر جواب تحریر کرے اور بادشاہ از رہ مرحمت خسروانہ یہ سوال نامہ (استفتا) لے لیتا تھا اس بیان سے علما کی غباوت اور شاہ وقت کی فقہی بصیرت ہی سمجھ میں آتی ہے۔

اسی افتتاحیہ ص:۱۲ کی تیرھویں سطر میں ہے......''**پاکستان مافیها و حاضرها** (بیروت ۱۹۷۴ء) میں بھی علمائے اہل سنت و جماعت کا کوئی ذکر وفکر نہیں''۔ ذکر وفکر کا یہ استعمال کم استطاعتی کے باعث خادم کی سمجھ میں نہ آسکا۔خیر صفحہ ۸/آخر اور صفحہ ۹/ابتدا میں جناب نے لکھنے والوں کی شکایت کی ہے کہ انھوں نے صرف اپنی پسند کے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے۔ان کی یہ حرکت مذموم ہے لیکن اس کا جواب یہ نہیں کہ جناب اور ہمنوا بھی وہی روش اختیار کریں۔صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ موضوع میں اپنے کارناموں کے اعتبار سے جن کا ذکر کیا جانا چاہیے، سب کا ذکر کیا جائے اور بطور خاص ان شخصیتوں کو نمایاں کیا جائے جن کو دوسروں نے نظر انداز کر دیا ہو۔

مؤرخ کے لیے محدث کی خصوصیات کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واقعات کے اسباب و علل سے بھی باخبر ہو اور یہ کہ اپنے ذاتی افکار کو دخل نہ دے ورنہ اس کی تمام کوشش جانب داری کی نذر ہو جائے گی اور اس کی روایت ثقاہت سے گر جائے گی۔

صفحہ ۹ سطر ۸ - بڑا ستم ہے کہ جلی حروف میں لکھے ہوئے چھوٹی تقطیع کے اٹھائیس صفحات کے مضمون کو مقالہ کہتے ہیں اور اس میں (اپنے خیال میں) تاریخ کی ایک انجانی شخصیت کے حالات زندگی، سیاسی و دینی خدمات کا تحقیقی جائزہ پیش کرنے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس نوع کا مضمون اتنے صفحات میں ایم۔اے کے ایک پرچہ کے بدل مقالے کے طور پر خادم کو پیش کیا جاتا تو ناکافی لکھ کر چلیپا زدہ واپس ہو جاتا، یہ تو مابعد دکتورات تحقیق انیق ہے، اسے کیسا ہونا تھا، یہ ایک پروفیسر کو خود ہی سمجھنا تھا۔

اسی صفحہ ۹ / پر جناب نے جہد آزادی سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف تحریک پاکستان کو ہی پیش نظر رکھا ہے، اس کے علاوہ اصل تحریک حریت کا کوئی ذکر نہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی متحدہ طور پر لڑی گئی۔ مغل حکومت کے دور میں اتحاد ویسے ہی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، اس کے بعد انگریز نے افتراق کے بیج بوئے، پہلے زبان کو تقسیم کیا، سب سے پہلے فورٹ ولیم کالج نے اُردو ہندی کو علیحدہ علیحدہ زبانیں بنایا، مگر اتحاد کا کرشمہ کہ میر امّن اپنی کتاب کی زبان کو ہندی ہی کہتے ہیں۔ زبان کی تقسیم کے بعد قوم کو جو پہلے ہی سے طبقوں میں منقسم تھی فرقوں میں بانٹ کر اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط کی۔ خادم مورخ نہیں، شہور وسنین کی تصریح کا مطالبہ نہ کیجیے، ادب کا طالب علم کہانی ہی سنا سکتا ہے مگر واقعات حقائق ہوں گے، زیب داستاں نہیں۔

ہندوستان پر مکمل طور پر تسلط ہو جانے کے بعد فرقوں کے مفکروں نے اپنے اپنے فرقہ کے لیے فلاحی و اصلاحی تحریکیں چلائیں مگر ان میں کوئی بھی تحریک حریت کہلانے کی مستحق نہیں، کیونکہ حصول آزادی کے لیے متحدہ اجتماعی کوشش ضروری تھی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی بار اتحاد کا مظاہرہ ترک موالات کی تحریک میں ہوا جس میں آزادی ہند کے ساتھ خلافت کا معاملہ بھی شامل تھا، یہ دور بڑا اجرأت آزما تھا، مگر متحدہ صفوں میں کوئی شگاف نہ تھا۔ خادم کی کھلی آنکھوں نے دیکھا ہے کہ عرس اجمیر کے اجتماع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اکبری مسجد میں حضرت مولانا قیام الدین

عبدالباری قدس سرہ کی صدارت میں جو جلسہ ہوا تھا اس میں علمائے کرام اور زعمائے عظام کے ساتھ بلبل ہند مسز سروجنی نائڈو بھی شریک تھیں۔ حصول آزادی (جسے اس زمانے میں سوراج کہتے تھے) کے آثار صاف نظر آرہے تھے، انگریزی مال کے مقاطعہ کے زیر اثر مانچسٹر کی ملوں کی چمنیوں نے دھواں اگلنا چھوڑ دیا تھا، حکومت پریشان تھی، مگر نہ جانے کیا ہوا کہ چوراچوری کے بعد گاندھی جی نے تحریک واپس لے لی، جس سے حریت پسندوں کو دھچکا لگا، بہت لوگ بددل ہو گئے، بدظنی عام ہوئی، کتنے ہی کہتے سنے گئے، ارے یہ کیا۔

دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

نہرو رپورٹ اور چودہ نقاط نے اتحاد کی فضا کو دفن ہی کر دیا، اس کے بعد وہ کشمکش شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں ملک تقسیم ہو گیا اور اس کا نتیجہ بھگتنا مقدر بن گیا۔

صفحہ ۱۱ر سے اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔

المولوی کی شخصیت کا پس منظر دکھانے کے لیے سیف اللہ المسلول قدس سرہٗ کا نام سب سے پہلے لکھا ہے اور ان کو شیخ الاسلام لکھا گیا ہے۔ بابا! تم آداب سے ناآشنا معلوم ہوتے ہو، تم ہی کیا جو القاب کے پیچھے دیوانے ہیں، سب کے یہاں بے راہ روی عام ہے۔

''شیخ الاسلام'' کا لقب ابن تیمیہ کے لیے مشہور ہے، ہم خدام اس کا استعمال اپنے سید و مولا غوث اعظم محی الدین رضی اللہ عنہ ورحمۃ اللہ علیہ کے لیے بھی نہیں کرتے، یہ تو ان کے مستِ مئے عشق ہیں۔

خادم تو ان کے لیے مولانا کا چلتا ہوا لفظ بھی پسند نہیں کرتا، وہ جس عصر میں تھے اس میں بڑا عالم ''مُلّا'' کہلاتا تھا، ان کے اساتذہ کرام ملا نور، ملا انوار اور ملا بحر العلوم (قدست اسرارہم) سب ملا تھے۔ فیض استاذ سے وہ بھی بلند مرتبۂ علمیہ پر فائز تھے، اس لیے مُلّا ہوئے۔

سید صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی) کم از کم آداب شناس تھے۔ حیات شبلی میں شبلی کے استاذ مولانا فاروق چریاکوٹی کا نام لکھ کر حاشیہ میں وضاحت کی ہے کہ مولانا (شبلی) بہ دو واسطہ ملا فضل رسول بدایونی کے شاگرد ہیں جو بہ دو واسطہ ملا بحر العلوم کے شاگرد ہیں (مفہوم)

صفحہ۱۲؍پر ’’سلسلہ عالیہ قادریہ وچشتیہ............حاصل تھی‘‘ یہ درست نہیں بلکہ وہ تمام سلاسل قدیمہ وجدیدہ آل احمدیہ میں مجاز بیعت تھے۔

اسی صفحہ۱۲ کی تیسری سطر میں ’’رہے‘‘ کا استعمال عجیب ہے۔ ’’بیعت ہوئے اور علم وتصوف کے اسرار ومعارف سے واقف رہے‘‘۔

اسی صفحہ۱۲؍ کے حاشیہ میں ’’شاہ وقت استفتا لیا کرتے تھے‘‘ کا اعادہ ہے جس کے متعلق تفصیل سے سمجھا چکا ہوں۔

اور اکمل التاریخ لکھنے والے کا نام غلط ہے، ان کا نام یعقوب حسین تھا اور ضیاؔ تخلص۔ لسان الحسان ضیاؔء القادری مشہور تھے۔ خادم کے برادر طریقی تھے ان کے پاس الفاظ کا وافر ذخیرہ تھا اور صرف میں احتیاط نہیں برتتے تھے مگر یہ ہرگز نہیں لکھ سکتے کہ بادشاہ وقت استفتا لیا کرتے تھے۔

اسی صفحہ۱۲؍حاشیہ۲ میں بڑے مزے کی بات لکھی ہے ’’جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی شیخ الاسلام حیات تھے۔ مسعود‘‘، یہ دستخط شدہ کیسی عجیب بات ہے۔ کیا جناب کوئی ایسی مثال دیں گے کہ مصنف نے انتقال کے بعد کتاب لکھی ہو؟ وہ کتاب انھیں کی تصنیف ہے تو اس وقت ان کے حیات نہ ہونے کی کوئی صورت نہیں۔

صفحہ۱۳؍ پر استاذ مطلق خیرآبادی کا تعارف شاگرد کی نسبت سے مضحکہ خیز ہے۔ حاشیہ میں مولانا آزاد کا جو حوالہ نقل کیا گیا ہے اس میں تو اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ کا استاذ مطلق سے تلمذ بطور فخر لکھا ہے نہ کہ بالعکس۔

صفحہ۱۶؍ پر محبّ رسول تاج الفحول قدس سرہ کو باوانور احمد اور علامہ فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہما کا تلمیذ لکھا ہے اور بیعت سیف اللہ المسلول قدس سرہ سے لکھی ہے۔ حالانکہ انھیں تلمذ اپنے والد ماجد سے بھی تھا، الکلام السدید میں اس کا ثبوت ہے۔

صفحہ۲۲؍ پر قطعۂ تاریخ لکھنے والے کا نام اور عہدہ دونوں غلط لکھے ہیں۔ مولانا ضیا احمد صدیقی (رحمۃ اللہ علیہ) نام ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فارسی ادب کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔

اسی صفحہ۲۲؍ پر خادم کا نام پروفیسر عبدالہادی محمد میاں لکھا ہے، خادم کا نام محمد ہے صرف محمد،

عبدالہادی لاحقہ ہے، خادم کے ساتھ پروفیسر کا لفظ غلط ہے، خادم عربی ادب کا مدرس رہا، پہلے مدرسہ قادریہ (بدایوں) میں، پھر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد) میں۔

پہلا باب ختم ہوا، اب دوسرے باب کا مطالعہ شروع کرتا ہوں جس کا عنوان ہی خادم کی سمجھ میں نہ آیا۔ جیسا کہ فہرست کے مطالعہ کے سلسلہ میں صراحت کی ہے۔

ص ۲۵ پر قصیدہ موسومہ چراغ انس میں محبّ رسول تاج الفحول قدس سرہ سے فاضل بریلوی یغفر اللہ لہ کا مدح سرائی کا تعلق ظاہر کرنے کے بعد جناب تحریر کرتے ہیں ''اس میں شک نہیں کہ مولانا محمد عبدالقدیر بدایونی اپنے سیاسی افکار میں امام احمد رضا سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں'' سبحان اللہ کیا خوب نتیجہ اخذ کیا ہے، اوپر کے بیان میں فاضل بریلوی کی نیازمندی کا ثبوت ملتا ہے نہ کہ المولوی کے ان سے متاثر ہونے کا۔

ص:۲۶ پر المولوی کے خطبۂ صدارت سے اقتباس کہ ''ہر مسلمان بھائی کا اپنے مسلمان بھائی سے لین دین ایک ملی فریضہ ہے اور مسلمانوں کی اقتصادی حالت اس احساس فرض کے بغیر درست نہیں ہوسکتی'' (مفہوم) کو مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی کسی ہدایت کے تابع کرنا بڑی جرأت ہے۔

اول تو یہ کہ یہ بات فاضل بریلوی کی ایجاد نہیں، امداد باہمی تو تاریخ اسلام کا اہم باب ہے، جس کی بنیاد عہد مواخات کو سمجھنا چاہیے، دوسری بات یہ کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ المولوی ترک موالات کا معاہد ہے، جس میں انگریزی مصنوعات کا مقاطعہ بھی شامل ہے، المولوی مسلمان بھی ہے اس لیے اس نے ''شدھ کھدر'' کی بجائے ''گاڑھے'' کو پسند کیا، جو شمالی ہند میں مسلمان بنکر تیار کرتے ہیں اور گاڑھے کا لباس ہی پہنا، المولوی کے جانشین زیب سجادہ قادریہ مجیدیہ شیخ سالم قادری دامت برکاتہم نے ان کی روش کے اتباع میں کفن کے لیے بھی گاڑھا ہی استعمال کیا، قول و عمل میں ایسی یکسانیت کی کوئی مثال مشکل ہی سے ملے گی جو زندگی کی سرحد بھی پار کر جائے۔

ایک خالص اسلامی قدیم نظریہ کو پیش کرنے کے جرم میں المولوی پر جناب فاضل بریلوی کی خوشہ چینی اور پیروی کا الزام سراسر بہتان ہے، اس سے جناب کی خامہ فرسائی کی حقیقی غرض آشکار

ہوگئی۔ جناب المولوی کو ’’درپسِ آئینہ طوطی‘‘ ثابت کرنے کے درپے ہیں، یہ بازی گری ہے کہ ذکر بظاہر المولوی کا ہے اور مدح وثنا کسی اور کی مقصود ہے۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ　　　　دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

انتساب پڑھتے ہوئے خادم نے وعدہ کیا تھا کہ اس پر بعد میں کچھ لکھوں گا۔ جناب نے اپنے اس مضمون کو مظلوم علما کے نام پیش کیا ہے، واقعی اب تو المولوی اس انتساب کا مستحق ہے کہ مظلوم ہے اور تاریخ سے اس کے نام اور کارنامے کو مٹایا جارہا ہے مگر یہ بھی یاد رکھیے کہ المولوی کے کردار کا ظلماً قتل آپ کی تحریر کررہی ہے مگر۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

اب مزید ابواب کا پڑھنا کارعبث ہے، بلی تھیلے سے باہر آگئی۔

اللھم اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولاالضالین.

گدائے خاک نشیں

محمد القادری

المدعو بہ ہادی القادری

۴؍شوال المکرّم ۱۴۰۲ھ/ ۲۶؍۷؍۱۹۸۲ء

عرب اور سفارت

موجودہ زمانہ میں جبکہ دنیا کی پنہائیاں قرب سے بدل گئی ہیں، دور دراز علاقے ایک دوسرے سے مربوط ہو گئے ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شرکت انسانیت اور حالات سے باخبری سیاست کہلاتی ہے۔ سفارت ناگزیر ہو گئی ہے، کون سی جگہ ہے جہاں یہاں وہاں کے سفیر نہ ہوں۔ لیکن یہ تمدن کی ہما ہمی کچھ ایسی قدیم نہیں، تاریخ کی دسترس میں بھی ایسا زمانہ ہے جب دنیا کے بہت سے علاقے ایک دوسرے سے قطعاً بے خبر تھے اور جو ایک دوسرے سے نزدیک تھے، جانتے پہچانتے تھے ان میں سفارتی تعلقات کی بجائے نبرد آزمائیاں گویا معمول میں داخل تھیں۔ اس لیے قدیم زمانے کے متعلق تحقیق کرنا کہ ان میں سفارت کا رواج تھا یا نہ تھا اور تھا تو ان کی سفارت کس قسم کی ہوتی تھی ضرور دلچسپی کی بات ہے۔

عرب قوم دنیا کی قدیم ترین اقوام میں شمار ہوتی ہے، اس نے بہت سے عروج وزوال دیکھے ہیں، طبقے ہلاک ہوئے ہیں اور صرف نام چھوڑ گئے ہیں یا کچھ حکایات، یہاں تک کہ اسلام سے پہلے کا دور بھی جاہلیت شمار ہوتا ہے کیونکہ ایسا کوئی دفتر موجود نہ تھا جس میں ان کے واقعات و حوادث اور تمدنی رسوم کو مدون کیا جاتا رہا ہو۔ ہمارے پاس باخبری کا ذریعہ ان کا ادب ہی ہے جس سے بڑی حد تک ان کے متعلق معلومات مل جاتی ہیں۔ پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ ہم پورے طور پر ان سے باخبر ہیں۔

اسلام سے پہلے کے زمانہ میں سفارت کا مفہوم سمجھنے میں ہمیں لغت سے مدد لینی پڑے گی۔ لغت میں سفیر کی تشریح یوں ملتی ہے- **السفیر الرسول و المصلح بین القوم** یعنی سفیر کے معنی نامہ بر اور قوم میں صلح صفائی کرانے والے کے ہیں۔ صاحب لسان العرب نے کہا ہے:

والجمع سفراء وقد سفر بينهم يسفر سفراً وسفارة اصلح یعنی سفیر کی جمع سفرا آتی ہے، مصدر سفر یا سفارہ ہے اور اس سے فعل **سفر یسفر** استعمال ہوتا ہے جس کے معنی صلح کرانے کے ہیں۔

لغت میں سفارت اور سفیر کے معنی صلح کرانا اور صلح کرانے والا ہیں۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ عرب جاہلیت میں یہ طریقہ رائج تھا کہ جب دو قبیلے آپس میں لڑ پڑیں اور یہ تو روز کا معمول ہی تھا تو کچھ لوگ بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کی کوشش کرتے تھے جو سفیر کہلاتے تھے۔

سفیر کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسے مرتبہ کا حامل ہو کہ فریقین اس کی بات مان لیں، اس لیے یہ اعزاز بالطبع اس قبیلہ کو ملنا چاہیے جو سب سے معزز ہو اور سب اس کی عزت کرتے ہوں۔ کعبہ کی مجاورت نے قریش کو یہ مرتبہ بخش دیا تھا کہ وہ عرب کے عام قبائل کی طرح غیر متمدن نہیں تھے، سارا عرب ان کا احترام کرتا تھا، اس لیے قریش کو ہی دوسرے مناصب کے ساتھ سفارت کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

قریش کے سردار اپنے منصب کو نباہتے تھے اور جب قبیلوں میں اختلاف ہوتا اور لڑائی ٹھن جاتی تو حالات کا جائزہ لیتے اور صلح صفائی کے لیے قریشی سفیر درمیان میں آ جاتے۔ ان کی بات تسلیم نہ کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ اس طرح وہ سفیر کو اپنے خلاف کر لیتے، سب سفیر کے فیصلے پر راضی ہو جاتے۔ اسلام سے پہلے جاہلیت میں آخری سفیر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ مانے جاتے تھے۔

جاہلیت میں سفارت اور سفیر کا مفہوم یہی تھا جو لغوی معنی کے مطابق ہے اسلام کے بعد بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ سفارت کے مفہوم میں وہ اصطلاحی پن پیدا نہیں ہوا جس سے ہم آج دوچار ہیں۔

تاریخ اسلام میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب فتنہ پیدا ہوا اور باغیوں نے امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو بات کرنے کے لیے سفیر بنا کر بھیجا، انھوں نے خلیفۂ وقت کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا **قد استسفرونی بینک و بینھم** (انھوں نے اپنے اور آپ کے درمیان مجھ سے سفارت چاہی ہے۔) صلح کا پیامبر بن کر آیا ہوں۔

سفارت کا یہی مفہوم اسلامی عہد میں کافی زمانہ تک محسوس ہوتا ہے۔ سلطنت بنوامیہ میں بھی یہی طریقہ رائج تھا، واقعۂ جمل اور دوسری لڑائیوں میں جب بھی صلح کی ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے سفارت سے کام لیا، حالانکہ ان کی حکومت کافی وسیع ہوگئی تھی اور تمدن میں بھی کافی تبدیلیاں پیدا ہوگئی تھیں، مگر سفارت کے مفہوم میں کوئی اہم تغیر وتبدل محسوس نہیں ہوتا۔

بنوامیہ کے زوال کے بعد بنوعباس نے اسلامی حکومت کا اقتدار سنبھالا اگر چہ انھیں اس وسیع علاقہ پر جو پہلے دمشق کے زیرنگیں تھا پوری طور پر دسترس حاصل نہ ہوسکا، مگر تمدنی اعتبار سے بغداد نے ساری دنیا کی راہبری کی، شان وشوکت اور حکمت وسیاست میں بہت بلند مقام حاصل کیا، اس عہد میں محسوس ہوتا ہے کہ سفارت کے مفہوم میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی۔

خیر وعافیت دریافت کرنے اور شادی بیاہ کے پیام لانے لے جانے کے لیے بھی سفیر بھیجے جانے لگے، یعنی ان کے لیے بھی سفیر کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ جیسا کہ ۲۷۹ھ کے واقعات میں ملتا ہے کہ خمارویہ بن احمد بن طولون نے عباسی خلیفہ معتضد کے پاس مصر سے ابن بصاص کو شادی کا پیام لے کر بھیجا۔ اس کے لیے بھی **ارسله سفيراً** (اسے سفیر بنا کر بھیجا) استعمال ہوا ہے۔

بغداد میں عباسی خلافت کے زمانے میں ہسپانیہ میں اموی خلافت کا دربار یورپ میں شان وشوکت، تہذیب وتمدن اور علم وفن کا مرکز بن گیا تھا، ہسپانیہ کے اموی تاجداروں کے درباروں میں بڑے بڑے سلاطین سفارتیں بھیجتے اور خود باریابی کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتے تھے۔

اموی دور میں رومی سلطنت کے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر کئی بار حملے کیے گئے تھے اور محاصرے کیے جاتے رہے تھے مگر جب دمشق کے سقوط کے بعد مشرق سے اموی سلطنت کا نام مٹ گیا، امویوں نے ہسپانیہ میں پناہ لے کر اپنی خلافت علیحدہ قائم کر لی تو رومی بادشاہ نے عباسی حکومت کے خلاف قرطبہ کے اموی خلیفہ عبدالرحمٰن اوسط کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ۲۲۵ھ میں قیصر نے ہدایا لے کر دربار قرطبہ میں سفارت بھیجی اور مشرق کو دوبارہ فتح کرنے کی طرف متوجہ کیا۔

عرب میں افتخار بالنسب عام تھا، مگر کنیزوں کا رواج بھی تھا، ان کی اولاد بھی حسب صلاحیت مراتب پاتی تھی، اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں منصب خلافت پھر بھی ایسے لوگ فائز ہوگئے۔

رومی بادشاہ نے اموی خلیفہ عبدالرحمٰن اوسط کی توجہ مبذول کرانے کے لیے مامون الرشید اور معتصم کے نام لکھنے کے بجائے ماؤں کے ساتھ ان کی کنیت استعمال کرتے ہوئے ابن مراجل اور ابن ماردہ لکھا، گویا وہ ان کی تحقیر کر رہا ہے کہ کنیز زادے اُسے ستاتے ہیں، عبدالرحمٰن نے قیصر کے ہدایا قبول کیے اپنی طرف سے بھی ہدایا کے ساتھ سفارت روانہ کی اور اپنے خاص شاعر یحییٰ کو قیصر کی خدمت میں بھیجا جس سے دونوں حکومتوں میں تعلقات استوار ہو گئے۔

بنوعباس کے زمانہ میں سفارت کا ایک یہ طریقہ بھی رائج تھا کہ تجارتی کاروبار کرنے والوں کے سپرد سرکاری خدمات بھی کر دی جاتی تھی، وہ لوگ اپنے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی سفارت کا کام بھی انجام دے لیا کرتے تھے اور دونوں حکومتوں میں رابطہ بنے رہتے تھے، جیسا کہ تاجروں کے ذریعہ ہند و چین کے درباروں میں بغداد کے ہدایا پیش کیے جانے اور وہاں کے تاجروں کے بغداد کے دربار میں حاضر ہونے اور تحائف پیش کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔

عباسی مرکز بغداد کی کمزوری کے زمانہ میں مختلف صوبے خود مختارانہ بادشاہتوں میں بٹ گئے تھے، ان میں مصر کے فاطمین بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مصر کے فاطمین کے زمانے میں بھی سفارت سے کام لیا جاتا تھا، ان کے زمانہ میں ''وساطت'' اور ''سفارت'' دو اصطلاحیں رائج تھیں وساطت سے وہ ایسی نمائندگی مراد لیتے تھے جو عوام اور بادشاہ کے درمیان ہوتی تھی اور سفارت دو بادشاہوں کے درمیان تعلقات ہموار کرنے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

عباسی عہد زریں میں ہی ہمیں سفارت کا وہ مفہوم ملتا ہے جو آج کل مستقل طور پر رائج ہے دوسری حکومتوں کے فرماں رواؤں کے پاس تحائف لے کر جانے والے اور حکومتوں کے تعلقات کو مضبوط بنانے والوں کو بھی سفیر کہا جانے لگا تھا۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر جس سفارت کا ذکر کیا جانا چاہیے اور جس کے بغیر عرب سفارت کی کہانی بالکل ادھوری رہے گی وہ بغداد کے عباسی خلیفہ ہارون رشید اور شارلیمان کے درمیان سفیروں کا تبادلہ ہے۔

شارلیمان یورپ کے ان عظیم بادشاہوں میں ہے جس نے رومن بادشاہوں کی جلالت شان کو تازہ کیا اور سلطنت کو وسعت دی، شارلیمان اور ہارون رشید کو ایک دوسرے سے قریب لانے

میں بعض مشترک مصالح نے اپنا فطری عمل کیا۔

(۱) شارلیمان کو ہسپانیہ کے اموی تاجداروں سے ہر وقت خطرہ تھا جن کے سیلاب کو روکنے میں اس کے دادا نے کامیابی حاصل کی تھی، مگر جب تک ان کی طاقت روبہ زوال نہ ہو شارلیمان کو اپنی حکومت کی سلامتی ہر وقت خطرہ میں محسوس ہوتی تھی۔

(۲) رشید کو بھی ہسپانیہ میں اموی اقتدار اپنی خلافت پر ایک بدنما داغ محسوس ہوتا تھا رشید کی بھی خواہش یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح ہسپانیہ کے اموی تاجداروں کا زوال ہو اور وہ علاقہ بھی دمشق کی طرح بغداد کے ماتحت صوبہ کہلائے۔

(۳) شارلیمان قسطنطنیہ کے قیصروں کو اپنا حریف سمجھتا تھا ان کی شوکت وعظمت کے زوال کا متمنی تھا۔

(۴) رشید بھی قیاصرہ کی دولت سے برسر پیکار تھا اور قسطنطنیہ کو اپنے ممالک محروسہ میں شامل کرنے کا متمنی تھا۔

(۵) بیت المقدس کے مسیحی زائروں کو رشید سے دوستی کے ذریعہ سے سہولت حاصل ہوتی تھی۔

(٦) قیصر کے مقابلہ میں یورپ کے مسیحیوں کی مدد شارلیمان کی دوستی سے حاصل ہو سکتی تھی۔

ان امور نے دونوں عظیم بادشاہوں کے لیے ایک دوسرے سے روابط پیدا کرنا ضروری کر دیا تھا اور یہ دوستی دو ایسی حکومتوں کے درمیان ہموار ہوئی جن میں سے ایک اسلامی خلافت بغداد کہلاتی تھی جو ایک مسیحی سلطنت قسطنطنیہ سے نبرد آزما تھی اور دوسری مسیحی شہنشاہیت تھی جو ایک اسلامی خلافت (اندلس) کے خلاف جنگ آزما تھی۔ اس سے یہ بات محسوس کی جا سکتی تھی کہ دو بالکل متضاد تصورات رکھنے والی حکومتیں ایک دوسرے سے دوستی بڑھائیں۔

تعلقات استوار کرنے کے لیے شارلیمان نے سفارت بھیجنے میں پہل کی، اس نے تین رکنی سفارت روانہ کی۔ رئیس وفد ایک یہودی عالم اسحاق نامی تھا کیونکہ اس زمانہ میں یہودی ہی عرب اور یورپ کے درمیان واسطہ بن سکتے تھے، یہ لوگ عرب سے علمی تعلق رکھتے تھے اور طب وغیرہ میں مہارت حاصل کر کے یورپ چلے آتے تھے، اسحاق کے ساتھ اور فرانسیسی بھی سفارت میں

شریک تھے جن میں ایک کا نام لیل فرائڈ تھا اور دوسرے کا نام بحمان بیان کیا جاتا ہے۔

یہ سفارت ہارون الرشید کے دربار میں باریاب ہوئی تحائف نذر کرنے کے بعد شارلیمان کی طرف سے استدعا کی کہ ان زائروں کے لیے جو بیت المقدس حاضر ہوں سہولتیں مہیا کی جائیں اور یورپی تاجروں کو حفاظت وسلامتی کی ضمانت دی جائے، رشید اس سفارت سے بہت خوش ہوا اور ان کی عرضی منظور کر لی، سفیروں کی واپسی پر ان کے ساتھ تحائف دے کر اپنی طرف سے سفارت روانہ کی۔

ہارون الرشید کے سفرا جو تحفے شارلیمان کے لیے لے گئے تھے ان میں نفیس قسم کے کپڑوں کے علاوہ ایک زنجیر فیل (ہاتھی دانت کے بنے ہوئے شطرنج کے مہرے) اور ایک عجیب گھڑی بھی تھی جس کی خوبی یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہر گھنٹے پر سوار گھڑی سے نکل کر گھنٹا بجا کر واپس جاتے تھے۔ ایک بجے ایک سوار نکلتا، دو بجے دو، اس طرح چوبیس گھنٹے بجانے کے لیے چوبیس سوار نکلتے تھے۔

تاریخ میں اس نادر گھڑی کا ذکر ''**الساعة الدقاقة**'' (کھٹکھٹانے والی گھڑی) کے نام سے ملتا ہے، جب یہ گھڑی یورپ پہنچی تو وہاں اسے جادوگری کا کمال سمجھا گیا اور لوگ اسے توڑنے پر تیار ہو گئے مگر شارلیمان نے انھیں ایسا کرنے سے روکا۔

ان تحفوں میں سے جو اپنے سفیروں کے ساتھ بغداد کے عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے شارلیمان کو بھیجے تھے اب بھی پیرس کے عجائب خانہ میں شطرنج کے کچھ مہرے محفوظ ہیں۔

شارلیمان اور رشید کے درمیان سفارت کے تبادلے میں نہ صرف دونوں حکومتوں میں سیاسی اتحاد پیدا ہوا بلکہ شارلیمان کو یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی مملکت میں بھی علمی مرکز قائم ہوں، جیسے کہ رشید کے عہد میں عباسی مملکت میں پائے جاتے تھے مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ یورپ میں جہالت ایسی راسخ تھی کہ اس کا اچانک دور ہونا ممکن نہ تھا، شارلیمان کی کوشش وقت سے پہلے تھی ابھی تو دراز زمانہ تک یورپ کو جہل کی تاریکی میں رہنا مقدر تھا۔

☆☆☆

عربوں کا فن حرب

خانہ بدوشی ان کے لیے ضروری ہو جاتی ہے جو ایسے ماحول میں زندگی گزاریں جہاں زندگی کی ضرورتیں آسانی سے فراہم نہ ہو سکیں۔عرب کے طبعی حالات بھی عام طور پر ایسے ہی ہیں کہ وہاں پانی بھی ہر جگہ وافر مقدار میں میسر نہیں آتا۔اس لیے جو قوم اس خطۂ ارض میں آباد ہوئی اسے مجبوراً خانہ بدوشانہ زندگی اختیار کرنی پڑی۔

خانہ بدوشانہ زندگی قوم میں کچھ خصوصیات پیدا کر دیتی ہے جن میں تکلیفوں کو سہنا اور مشکلوں سے مقابلہ کرنا سب سے اہم خصوصیتیں ہیں۔عرب قوم میں جو قوت برداشت اور بہادری عام ہے حقیقت میں وہ ان کی خانہ بدوشانہ زندگی کی دین ہے،کم سے کم اور معمولی سے معمولی چیز پر قناعت کر لینا اور بات بات پر جان کی بازی لگا دینا شہری زندگی بسر کرنے والوں کے بس کی بات نہیں۔

عربوں کی زندگی ''تنازع للبقا'' کا ہدف تھی اس لیے ہر اس مقام پر قبضہ کر لینے کی خواہش عام تھی جہاں کچھ سبزہ اور پانی میسر آ سکے،کیونکہ وہ خود تو اپنے اہلی جانوروں کے دودھ پر گزر بسر کر سکتے تھے مگر جانور بغیر چارہ پانی کیسے زندہ رہتے،اس لیے مسابقت کا جذبہ عام تھا اور اسی وجہ سے مختلف قبیلے اکثر باہم دست وگریباں رہتے تھے،یہاں تک کہ لڑائی گویا ان کی فطرت بن گئی تھی۔

اگرچہ عرب قوم مسلسل لڑتے رہنے کے باعث حرب وضرب کی عادی ہو گئی تھی لیکن چونکہ وہ خارجی دنیا سے بڑی حد تک الگ زندگی گزارتی تھی اس لیے اس کا فن حرب صرف نیزہ بازی یا تلوار چلانے کی حد تک محدود تھا،ہمیں عربی ادب میں اکثر ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں نیزہ، تلوار اور ان کے استعمال کا ذکر ہوتا ہے۔

نیزہ کی تعریف یہی سمجھی جاتی تھی کہ اس کی چھیڑ سیدھی،سخت اور لچکدار ہو،جیسا کہ عرب کے

مشہور صاحب معلقہ شاعر عمرو بن کلثوم اپنے نیزے کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

اذا عض التقاف بها اشمأزت   وولته عشوزنة زبونا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیزہ کی لکڑی کو اگر جھکانے کی کوشش کی جائے تو وہ خود جھکانے والے کا سر پھوڑ دیتی ہے۔

تلوار ایسی پسند کی جاتی تھی جو ہلکی پھلکی اور لچکدار ہو جیسا کہ عرب شاعروں میں سب سے کم عمر اور صاحب معلقہ شاعر طرفہ بن العبد کہتا ہے۔

وآليت لا ينفك كشحي بطانة

بعضب رقيق الشفرتين مهند

تلوار کے ساتھ عام طور پر تعریفی طور پر ''مھند'' (ہندستانی) استعمال کیا جاتا ہے، اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ ہندوستان فولاد سازی میں کافی ترقی کیے ہوئے تھا اور ہندی تلوار دوسری تلواروں کے مقابلہ میں زیادہ سبک اور مضبوط ہوتی تھی۔

نیزہ عام طور پر خطی پسند کیا جاتا تھا۔ ''خط'' یمامہ کا ایک موضع ہے جہاں کی چھڑ بہت عمدہ ہوتی تھی، اس لیے نیزہ کی تعریف میں خطی کی صفت عام طور استعمال ہوتی تھی۔

عرب بہادر نیزہ بازی میں ایسی مہارت رکھتے تھے کہ ان کی طعن (نیزہ سے زخم لگانا) بہت ہی شدید ہوتی تھی، ایک عرب شاعر اپنی نیزہ بازی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیزہ کی طعن نے ایسا چوڑا زخم لگایا جیسے بھری ہوئی مشک میں شگاف دے دیا جائے۔

وطعن كفم الزق

غذا والزق ملآن

شمشیرزنی میں بھی انھیں مہارت تھی، طرفہ بن العبد اپنی ضرب کی کیسی عمدہ تعریف کرتا ہے کہ ایک وار کے بعد دوسرے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، پہلی ضرب ہی قاتل ہوتی ہے۔

اخي ثقة لا ينثني عن ضريبة

اذا قيل مهلا قال حاجزه قدي

نیزہ اور تلوار دونوں عربوں کے محبوب ہتھیار تھے، لیکن ان کے استعمال کے مواقع علیحدہ علیحدہ تھے۔ جب مقابل سامنے آتا تھا تو دور سے ہی وہ اسے نیزوں پر رکھ لیتے تھے اور کوئی سخت جان قریب پہنچ جائے تو پر تلوار اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ عمرو بن کلثوم کہتا ہے ۔

نطاعن ما ترخی الناس عنا

ونضرب بالسیوف اذا غشینا

عربوں کی نیزہ بازی مشہور ہے، وہ لانبے لانبے نیزے استعمال کرتے تھے جن کے سروں پر فولادی برچھیاں ہوتیں، عرب نیزوں کو شتر مرغ کے پروں سے سجاتے تھے، ان کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ دشمن کو دیکھ کر نیزہ سر کے اوپر تولتے، تھوڑی دیر ہلاتے اور پھر پوری قوت سے اسے پھینکتے، نیزہ ہوا میں اڑتا ہوا اتنی تیزی سے اپنے نشانہ پر جاتا کہ اس کی اڑان سے خاص قسم کی آواز سنی جاتی۔

عربوں کی حربہ اندازی کا کمال اس وقت اور بھی عجیب معلوم ہوتا جب کہ وہ اپنے پیچھے دشمن کی آہٹ محسوس کرتے، بغیر پلٹے ہوئے صرف آہٹ پر پیچھے نیزہ پھینکتے اور اس وقت بھی ان کا نشانہ خطا نہ کرتا۔

عرب قوم میں تکلیفیں برداشت کرنے اور اپنی قوت بازو سے ضرورتیں پوری کر لینے کی خاص ہمت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان میں سے اکثر کا پیشہ ہی لوٹ مار رہا ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی وہ اس کے عادی رہے ہیں کہ ہواؤں سے بازی لے جانے والے گھوڑوں اور سانڈنیوں پر بیٹھ کر طویل سے طویل مسافت بغیر تھکن کے احساس کے طے کریں اچانک کسی پر جا پڑیں اور اپنا کام کر جائیں۔

دور جاہلی میں بھی ان کی لڑائیوں میں ان کا حربی شعور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ دشمن کو گھبرا دینے اور غیر متوقع تیزی سے حملہ کرنے کو سب اہم جنگی چال سمجھتے تھے، واقعہ بھی یہی ہے کہ جنگ میں یا تو ہتھیار کی برتری فتح دلاتی ہے یا دشمن کی سراسیمگی اسے ہزیمت پر مجبور کرتی ہے۔

اسلام سے پہلے عربوں کو منظم طور پر لڑائی کے میدان میں آنے کا بہت ہی کم موقع ملا تھا۔ جو لڑائیاں طویل بھی ہوئیں ان میں حصہ لینے والے دونوں جانب عرب ہی ہوتے تھے، اس لیے فن حرب میں کسی قسم کی جدتیں پیدا نہ ہوسکیں، لیکن طلوع اسلام کے بعد جب عرب اسلامی سپاہی بن

گئے تو انھیں مختلف ترقی یافتہ دشمنوں کے مقابل صف آرا ہونا پڑا، ان کے حربی شعور نے انھیں فن حرب میں جدتیں پیدا کرنے پر ابھارا اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

میدان جنگ سے فرار کو ہمیشہ باعثِ ننگ و عار سمجھا گیا ہے، عرب شاعروں میں صرف تابط شراًہی ایک ایسا آدمی نظر آتا ہے جو بھاگ کر جان بچالانے کا فخریہ انداز میں ذکر کرتا ہے ؎

اذا المرء لم یحتل و قد جد جده   اضاع وقاسی امره وهو مدبر

ولکن اخو الحرام الذی لیس نازه   به الخطب الاوهو للقصد مبصر

اس قسم کی دوسری مثال نہیں ملتی، لیکن اس سے ایک حربی نکتہ کی نشان دہی ہوتی ہے جسے بعد میں عربوں کے اسلامی لشکر نے عملی طور پر آزمایا اور اکثر کامیاب پایا۔

سریہ موتہ میں تمام کا تمام اسلامی لشکر کٹ کر رہ جاتا اگر سیف اللہ خالد شدت سے لڑتے ہوئے تابط شرا کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق دشمن کے نرغے سے نکال لانے کی کوشش نہ کرتے۔ اس طرح انھوں نے کافی خون دوسری جگہ استعمال کرنے کے لیے بچالیا، لیکن انہیں اور ان کے ساتھیوں کو زبان خلق نے ”فـــرّارون“ (بھگوڑے) کا لقب دیا، وہ سالار اعظم جس کی ذات ہر اعتبار سے سب سے ارفع و اعلیٰ تھی (ﷺ) ان سے خندہ پیشانی سے ملا اور اس نے انہیں ”کـــرارون“ (پلٹ کر حملہ کرنے والے) کے خطاب سے نواز کر ان کی ہمت بڑھائی، گویا فن حرب میں ”منظّم پسپائی“ کو بھی شامل کر لیا گیا۔

عربوں کی تاریخی لڑائیوں میں ہمیں ان کی خاص حکمت عملی اکثر یہ نظر آتی ہے کہ وہ پہلے تو بہت شدید حملہ کرتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان کے حملہ کا زور گھٹتا جاتا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے ہٹتے پلٹ پڑتے تھے، مگر اب دشمن کے لیے پیچھے ہٹنے کا امکان نہیں ہوتا تھا کیونکہ فتح کی سرشاری میں وہ اس سے بے خبر ہوتے تھے کہ کمیں گاہوں میں چھپے ہوئے محفوظ عرب سپاہی ان کے عقب پر چھائے جا رہے ہیں، اس طرح شکست کو فتح میں تبدیل کر دینا ان کی خاص حربی چال ہوتی تھی۔

عربوں نے طریقۂ جنگ میں ہی ایجادیں نہیں کیں جن سے مقابل سراسیمہ ہو جاتے تھے اور عددی برتری کے باوجود ہزیمت اٹھاتے تھے، بلکہ انھوں نے دوسروں پر ہتھیار کی برتری بھی

بہت جلد حاصل کر لی جس نے ان کی فتح کو یقینی بنا دیا اور بڑے بڑے مضبوط قلعوں والے اطاعت پر مجبور ہو گئے۔

عرب کے بادیہ نشین درندوں سے اپنے جانوروں کی حفاظت کے لیے ''مقلاع'' (گوپھن) کا استعمال کیا ہی کرتے تھے اور اس سے بھی بہت سچا نشانہ لگاتے تھے، اسی کو ترقی دے کر انھوں نے ''منجنیق'' بنا ڈالی، منجنیق کی ایجاد اپنے وقت پر آج کے ایٹم بم سے کم نہیں تھی، اس کی ہیبت نے بڑوں بڑوں کا جگر پانی کر دیا تھا۔

آج دنیا نیزہ، تلوار اور منجنیق سے بہت آگے بڑھ گئی ہے، اس لیے فن حرب بھی نئی صورت اختیار کر گیا ہے اور وہ قومیں جو سائنس کی دوڑ میں پچھڑ گئی ہیں ان کی بہادری کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہی ہے، پھر بھی عرب قوم اپنے ویران علاقہ میں اسی شان سے رہتی ہے جیسے قدیم زمانہ سے رہتی آئی ہے۔

عرب کے بدوی نوجوان آج بھی ہر وقت مسلح رہتے ہیں، عمدہ تلواروں، چمکدار خنجروں کے علاوہ ہلکی پھلکی رائفلیں بھی کاندھے سے لٹکائے رہتے ہیں، بندوق سے بھی وہ ویسا ہی سچا نشانہ لگاتے ہیں جیسا کبھی نیزے سے لگاتے تھے، عام طور پر وہ زمیں پر لیٹ کر شکار پر شست لیتے ہیں اور پھر گولی چلا دیتے ہیں۔

ان کا نشانہ اتنا سچا اور بے خطا ہوتا ہے کہ اسے دیکھ کر بے اختیار سائل دہلوی مرحوم کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے ؎

نشانہ باز ایسے ہیں، قدر انداز ایسے ہیں
ادھر چٹکی سے چھوڑا تیر، مٹھی سے کماں رکھ دی



کتا اور عرب

حیوان اور انسان کا رشتہ بہت قدیم ہے، ایک غیر معلوم مدت تک تو دونوں نے ایک سی ہی زندگی گزاری ہوگی، ایک دوسرے کے مقابل بھی رہے ہوں گے اور شریک کار بھی، مگر انسان کی تمدنی صلاحیت نے رفتہ رفتہ اسے حیوانی برادری سے دور کرتے کرتے بالکل خارج ہی کر دیا، یہاں پہنچ کر وحشت (جو حیوانی خصوصیات میں ہے) انسان کے لیے گالی کا مقام حاصل کر گئی، جنگلی کہلایا جانا کسی کو پسند نہیں آسکتا۔

آدمیت کا مفہوم ہی یہ لیا جاتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو حیوانیت سے بالکل ہی پاک صاف بنالے، لیکن ابتدائی دور حیات میں جو حیوانوں کے ساتھ گزارا تھا وہ حیوانوں کی صلاحیتوں سے باخبر ہو گیا تھا، آدمی بن کر اس نے ان فوائد سے دست بردار ہونا ٹھیک نہ سمجھا جو حیوانوں سے اسے حاصل ہو سکتے ہیں اور اس نے یہ کمال دکھایا کہ خالص حیوانی برادری کو بھی اپنی پچکاروں سے اہلی اور وحشی میں تقسیم کر دیا، وہ جانور جو آدمی کے آس پاس گھومنے لگے پالتو کہلائے اور جنھوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھا وہ جنگلی کے جنگلی ہی رہے۔

ان جانوروں میں جو آدمی کے ساتھ زندگی گزار لیتے ہیں کتا بھی ہے اور یہ اتنے قدیم زمانہ سے انسان کے ساتھ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ کتا کب سے انسان کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے؟ القرآن نے متقدمین کی جو حکایتیں ہمیں سنائی ہیں ان میں ''اصحاب کہف'' کا ذکر بھی ہے اور ان کے ساتھ ان کے کتے کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ان سے پہلے بھی کیا معلوم کتا کب سے انسان کے ساتھ رہتا چلا آیا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب دورِ جاہلی میں تھا، پھر بھی عربی شعر و ادب نے عربوں کے متعلق

معلومات کو بڑی حد تک محفوظ کر دیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ سے عرب میں کتے بھی آباد تھے البتہ ان کے مرتبہ سے متعلق مختلف اور متضاد باتیں سامنے آتی ہیں، تعریف و توصیف بھی ملتی ہے اور مذمت و ہجو بھی۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثریت کتوں کی طرفدار ہے، اس لیے ہم پہلے انھیں کا نقطۂ نظر پیش کریں گے۔

جاہلیت میں یہ اعتقاد عام تھا ''نام'' انسان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی لیے جب کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا تو وہ اس کا نام رکھنے کے لیے اپنے قاعدہ کے مطابق فال لیتا، وہ گھر سے باہر نکلتا تا کہ پرندوں کو اُڑائے، ان کے اُڑنے کی سمت سے بھی سعد و نحس کا خیال عام تھا، ایسے میں اگر کسی کی زبانی ''حجر'' (پتھر) کا لفظ سننے میں آ جائے یا کسی پتھر پر نگاہ پڑ جائے تو نومولود کا نام ''حجر'' رکھ دیا جاتا اور یقین کیا جاتا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر شدت اور سختی کا مظاہرہ کرے گا اور اگر کہیں گدھا نظر آ جاتا تو پھر بچہ کا نام بھی ''حمار'' (گدھا) رکھا جاتا اور سمجھا جاتا کہ بڑی عمر پائے گا اور کتا سامنے آ جاتا تب تو بچے کا نام اسی کے نام پر ''کلب'' یا ''کلیب'' (کتا یا کتے کا بچہ) رکھ دیا جاتا اور سمجھا جاتا کہ یہ کتے کی طرح ہوشیار، نگران کار، محافظ، بلند آواز اور نام آور ہوگا۔

کتوں کو پسند کرنے والے اسے ہوشیار جانور سمجھتے تھے اور اسی لیے اشراف عرب اپنے بچوں کا نام اسی کے نام پر رکھتے تھے تا کہ ان میں کتوں جیسی ہوشیاری آ جائے۔ اس سلسلہ میں جو نام سب سے پہلے لیا جانا چاہیے وہ ''کُلیب ابن ربیعہ'' کا نام ہے جس کی عظمت ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہے، کسی کو باعزت کہنا ہوتو ''اعز من کُلیب وائل'' (کلیب سے زیادہ باوقار) کہتے تھے۔

''کُلیب''، عرب کی مشہور شخصیت ہے، جاہلیت میں کوئی اس کی ہمسری کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، اسے اپنی بڑائی کا ایسا شدید احساس تھا کہ دوسروں کے لیے وہ وبال جان بن گیا تھا، جس چراگاہ یا جس چشمہ کو چاہتا اپنے لیے مخصوص کر لیتا، کسی کی مجال نہ تھی کہ اس طرف نگاہ کر سکے، کہا جاتا ہے اس نے ایک کتے کا پلا بھی پال رکھا تھا، جہاں جہاں وہ گھومتا یا جہاں تک اس پلے کی آواز سنی جا سکتی وہ سارا علاقہ ممنوعہ سمجھا جاتا اور کلیب کی اجازت کے بغیر کوئی ادھر سے

گزر بھی نہ سکتا۔

یہ عزت وشرف جو کلیب وائل کو حاصل تھا اس کے متعلق جاہلیت کا ذہن یہ سوچ سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہی تھی کہ اس کے نام کُلیب کی تاثیر نے اسے اتنا ہوشیار اور بہادر بنا دیا تھا کہ سب اس کی عزت کرنے پر مجبور تھے۔

''کلیب'' (کتے کا پلّا) کے علاوہ عرب میں کلب (کتا) اور کِلاب (بصیغۂ جمع کتے) بھی نام رکھے جاتے تھے، بلکہ کلب کے ساتھ کنیت میں بھی کسی قسم کا عیب نہیں سمجھا جاتا تھا، چنانچہ ''بنو کلبہ'' (کتیا کے بیٹے) عرب کا مشہور خاندان گزرا ہے۔

جاہلیت میں کتوں کی خصوصیات سے متأثر ہو کر اپنے بچوں کا نام کلب وغیرہ رکھنا ہی باعث برکت نہیں سمجھتے تھے بلکہ عربوں میں کتوں کو خاص خاص ناموں سے پکارنے اور اپنے حسب نسب کی طرح کتوں کے حسب نسب کو محفوظ رکھنے کا بھی رواج تھا، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک کتا کتنا مکرم جانور تھا مثلا جذعان کے کتے کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا نام ''سہلب'' تھا اور اس کا نسب نامہ یہ ہے، سہلب بن البراق بن یحی بن ذناب بن مظفر بن محارش۔ سھلب کے پانچ دادوں کے نام بھی اس سے معلوم ہوتے ہیں، کتوں کے یہ نام انسانوں کے لیے بھی استعمال ہوتے تھے۔

ایک شاعر مہمانوں کی خاطر اپنے رات تمام جاگتے رہ کر انتظام کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کتے درواس کو نہیں بھولتا، جو بھونک کر مہمانوں کو گویا راستہ بتاتا رہا اور رات تمام وہ بھی شاعر کے ساتھ سویا نہیں۔

بتناوبات جليد الليل يضربنا   بين البيوت قرانا نبح درواس

شعرا کے کلام میں کتے کا تذکرہ اکثر اچھے الفاظ میں ملتا ہے۔ ایک شاعر اپنے ممدوح کی وفا شعاری کو اس طرح ادا کرنے میں کوئی برائی محسوس نہیں کرتا کہ اسے کتے سے تشبیہ دے۔

انت كالكلب فى حفاظك للود   وكالليث فى قراع الخطوب

(تو محبت کی پاسداری میں کتا ہے اور خطرات کے مقابلہ میں شیر۔)

عامر بن طفیل نے تو کمال کر دیا کہ اپنے مددوں کو (جس وقت وہ ہتھیار سجائے لڑائی کے لیے

تیار ہے) کتے کی طرح سرخ آنکھوں والا بھی کہا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس سے ممدوح یا اس کی قوم برانہیں مانے گی بلکہ اس تعریف پر سب خوش ہوں گے

ومـد جـح يسعى بشكته　　　　محمرة عيناه كالكلب

(وہ ہتھیار لگائے چلتا ہے، اس کی آنکھیں کتے کی طرح لال لال ہیں)

عرب شعرا کتے کے بااخلاق ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس سے مالکوں کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی کا اظہار مقصود ہوتا ہے:

فبـابک الیـن ابـوابهم　　　　ورادک آهـلة عـامـره

(تیرے دروازہ پر حاضری سب سے زیادہ آسان ہے اور تیرا گھر بھرا پرا ہے۔)

وكلبک آنس بالمعتفين　　　　مـن الام بـابـنتهـا الـزائـره

(اور تیرا کتا آنے والوں پر اس ماں سے زیادہ مہربان ہے جو اپنی لڑکی کی پذیرائی کرے۔)

ایک اور شاعر کتے کے مہمان کو خوش آمدید کہنے کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے

یکـاد اذا ماابصر الضیف مقبلا　　　　یـکلمه من حبه وهو اعجم

(جب وہ کسی مہمان کو آتا دیکھتا ہے تو گویا کہ وہ محبت سے اس سے ہم کلام ہوتا ہے۔)

جاہلیت میں ایسے لوگ بھی پائے جاتے تھے جو کتوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور ہر اخلاقی خرابی کو کتے سے منسوب کرتے تھے، لیکن یہ لوگ کتوں کے جو عیب بیان کرتے تھے وہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ مثلاً یہ کہنا کہ کتا مردار خور ہوتا ہے کوئی عیب نہیں، تمام برتر نسل کے درندے بھی مردار خوری کو برانہیں سمجھتے۔ یا کتوں کے متعلق کہنا کہ وہ بدبودار جانور ہوتا ہے بالکل غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کتا بدبودار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ کیسی ہی ورزش و دادوش کیوں نہ کرے اسے پسینہ نہیں آتا، تو اس کے بدبودار ہونے کا کیا سوال ہے۔

یہ الزام لگانا کہ کتا خراب جانور ہے، بچوں کو کاٹ کھاتا ہے یہ تو کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ کپڑے پھاڑ ڈالتا ہے، پڑوسیوں کو تنگ کرتا ہے اور مہمانوں کو تکلیف دیتا ہے یا وہ بے دھڑک ہر جگہ پیشاب کر دیتا ہے یہ تمام باتیں تو ہر جانور سے متعلق کہی جاسکتی ہیں، ان میں کوئی خاص وزن ہرگز نہیں۔

کتوں کے مخالفین کے گروہ کو اسلام کے بعد تقویت حاصل ہوگئی کیونکہ قرآن نے آیات الٰہی

کوجھٹلانے والوں اور گمراہی کا راستہ اختیار کرنے والوں کی تمثیل کتوں سے دی اور اس سے ان لوگوں کی تحقیر مقصود تھی۔

مثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث وان تترکہ یلھث ذلک مثل القوم الذین کذبوا بآیاتنا. (القران، ۹/۱۲)

اس کی مثال کتے کی سی ہے اگر تو اس پر حملہ کرے وہ زبان نکال دیتا ہے اور اگر چھوڑ و تب بھی زبان نکال دیتا ہے یہ ان لوگوں کی مثال ہے جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی یہ روایت تو بہت مشہور ہے کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتے نہیں آتے، **ان الملائکۃ لا تدخل داراً فیہ کلب.**

اور پھر جب نبی خاتم ﷺ نے کتوں کو مار ڈالنے کا حکم دیا تو کتوں سے نفرت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

امرنا رسول اللّٰہ ﷺ بقتل الکلاب حتی ان المرأۃ لتقدم بکلبھا من البادیۃ فنقتلہ. ثم نھانا عن قتلھا. قال علیکم بالاسود البھم ذی النکتتین علی عینیہ فانہ شیطان.

ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے کتوں کے مارنے کا حکم دیا۔ یہاں تک کہ کوئی عورت جنگل سے کتا ساتھ لاتی ہم اسے بھی مار ڈالتے، پھر ہمیں ان کے قتل کرنے سے منع کر دیا، فرمایا انھیں کو مارو جو گہرے کالے ہوں اور ان کی آنکھوں پر ٹیکے ہوں کہ وہ شیطان ہوتے ہیں۔

حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کتوں کے مار ڈالنے کا حکم دیا ہم نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک مدینہ کے تمام کتے مار نہ ڈالے اور عورت کا کتا بھی۔

امرنی رسول اللّٰہ ﷺ ان اقتل الکلاب فکنا نقتلھا فانتقلت الٰی ظاھر بنی العامر فاذا بعجوز مسکینۃ معھا کلبھا ولیس بقربھا انسان فقالت ارجع الی النبی فاخبرہ ان ھٰذا الکلب

يونسني وليس قربي احد فرجع اليه فاخبره فامر بقتل كلبها فقتله وقال في حديث آخر انه لما فرغ من قتل كلاب المدينة وقتل كلب المرأة قال الان استرحت.

مجھے رسول اللہ ﷺ نے کتے مارنے کا حکم دیا، ہم انھیں مار ڈالتے تھے۔ میں بنو عامر کے علاقے سے باہر گیا وہاں ایک عورت کے پاس کتا تھا، اس کے پاس کوئی آدمی نہ تھا، اس نے کہا نبی کے پاس جاؤ، بتاؤ کہ یہ کتا ہی میرا مونس ہے، میرے پاس کوئی بھی نہیں انھیں مطلع کیا تو اس عورت کے کتے کو مار ڈالنے کا حکم دیا۔ ایک اور حدیث میں بیان کیا کہ جب مدینہ کے سارے کتے اور اس عورت کا کتا بھی مار ڈالا یا، تو کہا اب مجھے آرام ملا۔

اسلام میں کتے سے بھی گیا گذرا وہ شخص سمجھا گیا جو معصیت میں مبتلا ہو اور خیانت کا مرتکب ہو۔ ایک حدیث میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک مقتول کو دیکھ کر اس کے بارے میں پوچھا، معلوم ہوا کہ اس شخص نے دوسرے کی بکری پکڑ لی تھی تو اس پر کتے نے حملہ کر دیا اور مار ڈالا۔ تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا......

قتل نفسه واضاع دينه وعصى ربه وخان اخاه وكان الكلب خيراً منه

اپنی جان دی، دین کھویا، گناہ کیا اور بھائی سے خیانت کی، کتا اس سے بہتر تھا۔

اسلام کے بعد عرب میں عام طور پر کتوں سے بیزاری پائی جانے لگی اور وہ توقیر باقی نہ رہی جو جاہلیت میں تھی۔ اگرچہ فقہائے کرام کی رائیں کتے کے بارے میں مختلف اور متضاد پائی جاتی ہیں لیکن احتیاط اسی میں سمجھی گئی کہ کتوں سے دور رہا جائے اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

اسلامی دور کے شعرا میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کتے کی تعریف کر جاتے ہیں مگر زیادہ تر کتا حقیر سمجھا جاتا ہے اور مقام ذم وہجا میں ہی اس کا ذکر ملتا ہے۔

مشہور شاعر ابوالطیب متنبّی کافور کی ہجو کرتے ہوئے کہتا ہے:

ماكنت احسبني ابقى الى زمن　　　يسئى بي فيه كلب وهو محمود

(مجھے خیال نہیں تھا کہ اس زمانہ تک زندہ رہوں گا کہ میرے ساتھ ایک کتا برائی سے

پیش آئے جس کی تعریف کی جاتی ہے۔)

ابوالعلاءالمعری ابن الحصین کی ہجو میں کہتا ہے:

لا تغتبط یابن الحصین بصبیة　　اضحت لدیک کثیرة الا ولاد

لا فخر فیک ولا افتخاراً فیهمو　　ان الکلاب کثیرة الاعداد

(حصین کے لڑکے اس پر غرور مت کر کہ ایک چھوکری تیرے پاس بہت سے بچوں والی ہوگئی ہے نہ تیرے لیے بڑائی ہے نہ ان سب کے لیے، کیونکہ کتے ہوتے ہی بہت ہیں۔)

اس عام نفرت کے باوجود جو عہد اسلام میں کتوں سے متعلق پائی جاتی ہے کتے کی ضرب المثل وفاداری اپنی جگہ پر رہی۔ اشعار میں اس کا ذکر ملتا ہے جیسا کہ حارث بن صنعہ کے ان اشعار سے ظاہر ہے جو اس نے واقعہ کے بعد کہے کہ وہ دوستوں کے ساتھ سیر وتفریح سے واپس آیا تو گھر پر اپنی بیوی اور اپنے ایک دوست کی لاشیں پڑی پائیں، یہ دوست کسی بہانے سے ساتھ نہیں گیا تھا، تنہائی اور دوست کے اعتماد کا غلط فائدہ اٹھاتا تھا، کتے نے انھیں ایسی حالت میں دیکھا تو دونوں کو ختم کردیا۔

ومازال یرعی ذمتی ویحوطنی　　ویحفظ عرسی والخلیل یخون

فیا عجبا للخل یهتک حرمتی　　ویا عجبا لکلب کیف یصون

(وہ کتا برابر حق ادا کرتا اور میری دلہن کی حفاظت کرتا رہا اور دوست نے خیانت کی، کتنا عجیب ہے کہ دوست تو عزت لوٹ لے اور کتا اس کی حفاظت کرے۔)

غرض کے اسلام کے بعد کتے سے محبت کا دور ختم ہوگیا، شکاری کتے شکار یا چوکیداری کے لیے ضرور پالے جاتے رہے مگر عام کتے پرانی دوستی سے محروم ہوگئے، ان میں سے اکثر کو ویرانوں کی طرف لوٹ جانا پڑا، پھر بھی چونکہ کتا انسان کے ساتھ رہ کر بہت سی آسائشوں کا عادی ہوگیا تھا اسی لیے بہت سوں سے شہر کی گلیاں چھوڑی نہ گئیں اور جہاں بھی انھیں ذرا سا آسرا ملا وہ کھڑکیوں، دروازوں اور دکانوں کے سامنے روٹی کے ٹکڑوں یا پھینکی ہوئی ہڈیوں کی آس میں اب بھی بیٹھے نظر آتے ہیں۔



تلوار کی چھاؤں میں

عرب قوم کی زندگی سادہ اور ماحول رنگینیوں سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا ادب رواں اور حقیقت سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے، ادب عربی کا مطالعہ ناظر کو اس نتیجہ پر پہنچا تا ہے کہ عربی ادب کی وہ خصوصیت جو تمام اصناف سخن میں پائی جاتی ہے، وہ ''آمد'' ہے۔ تکلف اور آورد کا نہ عرب قوم کی زندگی میں گزر ہے اور نہ وہ ان کے شعر وادب میں عام طور سے برتی جاتی ہے۔

عرب شعرا میں ہمیں ایسے گنتی کے ہی شاعر ملتے ہیں جو شعر کا اہتمام کرتے تھے اور ان کا شعر ''حولیات'' میں شمار کیا جاتا تھا، عام طور پر عرب شعرا جذبات کی رو میں شعر کہا کرتے تھے۔

ابن رشیق نے ''آمد'' کی دو قسمیں کر دی ہیں ''ارتجال'' اور ''بدیہہ'' ان دونوں میں بہت ہی کم فرق ہے، ارتجال بدیہہ کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے جس میں شاعر سوچنے کے لیے گردن بھی نہیں جھکا تا اور سننے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر پہلے سے لکھا ہوا شعر سنا رہا ہے۔

ارتجال کی بہترین مثالوں میں ابوالاسد کا وہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے جو اس نے ''الھادی'' کے سامنے قصیدہ پڑھتے ہوئے اس کے ٹوکنے پر پڑھ دیا اور سب یہی سمجھے کہ یہ شعر بھی قصیدہ میں پہلے سے تھا مگر جب قصیدہ دیکھا گیا تو وہ شعر کہیں نہیں تھا۔

ابوالاسد قصیدہ پڑھ رہا تھا جب اس نے یہ شعر پڑھا ؎

یا خیر من عقدت کفاہ حجرتہ　　　وخیر من قلدتہ امرھا مضر

تو موسیٰ الھادی نے درمیان میں کہا ''**إلا من یا بائس**'' شاعر نے اسی روانی میں شعر پڑھا ؎

إلا النبی رسول اللّٰہ ان لہ　　　فخراً وانت بذلک الفخر یفتخر

ایسی روانی سے شعر کہنا اس وقت اور بھی لطف دے جاتا ہے جب سننے والا یہ سمجھ ہی نہ رہا ہو

کہ شاعر شعر کہہ رہا ہے، جب اس پر یہ بات واضح ہوتی ہے تو اس کا اثر اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ابوالعتاہیہ کے یہ اشعار ارتجال کی بہترین مثال ہیں، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات گزار رہا تھا صبح قریب تھی اس نے مرغوں کی اذانیں سنیں تو کہا ؎

ابو العتاهیه	**هل رأیت الصباح لاحا**
ساتھی-**نعم** (ہاں)	(کیا تو نے دیکھا صبح نکلی)
ابو العتاهیه	**وسمعت الدیک صاحا**
ساتھی-**نعم** (ہاں)	اور مرغ کی اذاں سنی
ابو العتاهیه	**انما یبکس علی المغترو ناحا**
	(بیشک وہ غافل پر رویا اور نوحہ کیا)

اب ساتھی چونکا اور اس نے اسے محفوظ کرلیا اور دوسروں کو سنایا۔

بدیہہ گوئی کا اس سے کم مرتبہ ہے۔اس میں شاعر تھوڑا سوچ کر شعر کہتا ہے اور اگر کتابت کا سامان موجود ہو تو جلدی جلدی لکھ لیتا ہے اور سناتا ہے مگر حقیقت میں یہ فرق برائے نام ہے، ارتجال اور بدیہہ دونوں شاعر کے کمالِ فن اور حاضر دماغی کی شہادتیں ہیں۔

عرب شاعری تصنع سے دور رہی ہے اس لیے عرب شعرا میں عام طور پر روانی سے شعر کہنے کی صفت پائی جاتی ہے، جاہلیت میں عمرو ابن الہند کے سامنے حارث بن حلزہ نے قصیدہ کا قصیدہ فی البدیہہ پڑھا، اس قصیدہ کی یہی خوبی نہیں ہے کہ شاعر نے اسے اس طرح ارتجالا پڑھا تھا، وہ قصیدہ اپنے زور بیان اور خوبیوں کی بنا پر عربی ادب کے بہترین قصیدوں میں شمار کیا جاتا ہے اور اس کا شاعر بلا اختلاف سب سے بڑے سات شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اسلامی شعرا میں روانی سے شعر کہنے والوں میں ابونواس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔الرشید کے دربار میں وہ جو شعری شاہکار پیش کرتا رہا ہے وہ تو اپنی جگہ ہیں ہی، ایک مرتبہ ابونواس خطیب کے ساتھ جامع مسجد گیا، خطیب نے تفریحاً اس سے کہا ابونواس یہ تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ شعر میں تیرا جواب نہیں ہے مگر خطبہ دینا دوسری بات ہے۔

ابونواس فوراً کھڑا ہو گیا اور اس نے بولنا شروع کر دیا

منحتكم يا اهل مصر نصيحتى	الا فخذوا من ناصح بنصيب
رما كم اميرالمؤمنين بحيه	اكول لحيات البلاد شروب
فان يک باقی سحر فرعون فيكم	فان عصى موسى بكف خصيب

خصیب نے اس سے معذرت کی کہ میں نے مزاح میں کہا تھا اور اقرار کیا کہ بہترین مقرر بھی اس سے بہتر خطبہ نہیں دے سکتا۔

الرشید کا دربار ادیبوں اور شاعروں سے آراستہ رہتا تھا اور اکثر شعرا بدیہہ گوئی کا جوہر دکھاتے تھے۔ ایک مرتبہ ہارون الرشید نے شعرا کو مخاطب کرتے ہوئے ایک مصرع کہا، جماز نے فوراً مصرعے پہنچائے اور قطعہ مکمل ہو گیا:

الرشید	الملک لله وحده	ملک صرف خدا کے لیے ہے
جماز	وللخليفة بعده	اس کے بعد خلیفہ کے لیے
	وللمحب اذا ما	اور عاشق کے لیے جب
	حبيبه بات عنده	اس کا محبوب اس کے پاس رات گزارے

عربی ادب میں فی البدیہہ کہے جانے والے اشعار کی کمی نہیں ہے، مگر ان میں بھی ان اشعار کا مرتبہ سب سے بلند ہے جو شاعر نے موت کو سامنے دیکھتے ہوئے کہے، ایسے موقع پر دماغ کا حاضر رہنا اور شعر کہہ سکنا واقعتاً تعجب انگیز ہے۔

تلوار کی چھاؤں میں طرفہ بن العبد البکری نے کس اطمینان سے یہ شعر کہے:

ابا منذر كانت غروراً صحيفتى	ولم اعطكم فى الطلوع مالى ولا عرضى
ابا منذرا فنيت فاستبق بعضنا	حنانيک بعض الشرا هون من بعض

عبد یغوث ابن ملاءة نے مرتے مرتے جو قصیدہ کہا ہے اسے تلوار کی چھاؤں میں بہترین قصیدہ کہنا چاہیے، اس کا منہ بند کر دیا گیا تھا، قاتل ڈرتے تھے کہ وہ مرتے مرتے ہجو نہ کر دے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ گالی نہیں دے گا تو اس کا منہ کھولا گیا تا کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے حال پر

رونا چاہے تو رو لے، مگر اس نے قصیدہ کہنا شروع کر دیا۔

اقول وقد شدوا لسانی بلسة　　　امعشرتیم اطلقو من لسانیا

فیاراکبا اما عرضت فبلغن　　　ندامای من نجران ان لا تلاقیا

یہاں پر اس نے اپنے قاتلوں سے خواہش کی کہ وہ ایک ہزار اونٹ لے کر اسے چھوڑ دیں مگر انھوں نے نہ مانا اور قتل پر ہی مصر رہے تو اس نے کہا:

فان تقتلونی تقتلونی بخیرکم　　　وان تطلقونی تحرونی بمالیا

اس حالت میں ایسی روانی سے ایسے معیاری شعر کہنا شاعر کے کمال اور اس کی عجیب وغریب قلبی طاقت اور بہادری کا بین ثبوت ہے۔

حیرہ کے بادشاہ نعمان ابن منذر نے اپنے عتاب اور کرم کے دن مقرر کر رکھے تھے عتاب کے دن جو سامنے گیا سمجھو اس کی کمبختی آ گئی، وہ اسے قتل کیے بغیر نہ چھوڑتا، ایسے ہی ایک دن عرب کا مشہور اور صاحب کمال شاعر عبید بن الابرص نعمان کے پاس پہنچ گیا، نعمان نے اس سے کہا مرنے سے پہلے مجھے اپنا وہ شعر تو سنا دو

اقضر من اھلہ ملحوب　　　فالقطیات فالذنوب

عبید نے کس اطمینان اور سکون سے کہا وہ نہیں یہ سنو:

اقضر من اھلہ عبید　　　فالیوم لا یبدی ولا یعید

اسلامی دور کے شعرا میں علی ابن الجہم بڑا شاعر گزرا ہے۔ عباسی بادشاہ المتوکل کے دربار میں اس کا بڑا مقام تھا، جس وقت اسحاق ابن اسمٰعیل کا سر المتوکل کے سامنے پیش کیا گیا تو ابن الجہم نے فی البدیہہ مبارکباد پیش کر کے داد وتحسین حاصل کی۔

اھلا وسھلا بک من رسول　　　جئت بما یشفی من الغلیل

برأس اسحاق ابن اسمٰعیل

اور پھر دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ قادر الکلام اپنے فن کا مظاہرہ اس وقت بھی کر سکتا ہے جب کہ اسے برہنہ کر کے سولی پر لٹکایا جا چکا ہے، اس وقت علی ابن الجہم کے یہ شعر کتنے لاجواب ہیں:

لـم يـنـصبـو بـالشازياخ عشية او	اثـنـيـن مـغـلـولا ولا مـجهـولا
نـصبـوا بـحمد اللّٰه مل ءَ عيونهم	حسـنـا ومـل ءَ قـلـوبهـم تبجيلا
مـاضـره ان بـزعـنـه لبـاسـه	فـالسيف اهـول مـا يـرى مسلولا

تمیم ابن جمیل کا نام بھی اس فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے جنھوں نے تلوار کی چھاؤں میں ہوش وحواس نہیں کھوئے اور اس وقت بھی اس نے کمال فن کا اظہار کیا جب موت میں اور اس میں ذرا سے اشارے کی دُوری تھی۔

المعتصم کے دربار میں چمڑے کا وہ فرش بچھایا جا چکا تھا جسے ''نطع'' کہتے ہیں جس پر بادشاہ کے سامنے دربار میں خاص خاص لوگوں کو قتل کیا جاتا تھا، جلاد نے تلوار سونت لی تھی مگر ابن جمیل بغیر کسی پریشانی کے یہ اشعار کہتا چلا جا رہا تھا:

اری الموت بین النطع والسیف کامنا	یـلا حـظـنـی مـن حیث ما اتلفت
واکبـر ظـنـی انک الیـوم قـاتلـی	وای امـرئ مـمـا قضی اللّٰه یفلت
وای امـرئ یـدلـی بـعـذر و حـجة	وسیف الـمنا یا بین عینیه مصلت
یـغـر عـلـی الاوس بن تغلب موقف	یسـل عـلـی السیف منه واسکت
ومـا حـزنـی انی اموت وانـنـی	لا عـلـم ان الـموت شیئ موقت
ولـکـن خـلـفـی صبیة قد تـرکتهم	واکبـادهـم مـن خسـرة تتنقت
کـانـی أراهـم حیـن انـعـی انهـم	وقد خمشوا تلک الوجوه وصوتوا
فـان عشـت عاشوا خافضین بنعمة	اذود الردی عنهم وان مت موتوا
فـکـم قـائـل لا ابـعـد اللّٰـه داره	وآخـر جـذلان یسـر ویشـمـت

تلوار کی چھاؤں میں ابن جمیل کے ان اشعار کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہوگئی ہے کہ انھیں سن کر المعتصم نے نہ صرف ابن جمیل کے قتل کا حکم واپس لے لیا بلکہ اسے زندگی گزارنے کے لیے کام بھی دلایا۔



دھوپ چھاؤں☆

اس دنیا نے عروج وزوال کے سینکڑوں واقعات دیکھے ہیں، بہار وخزاں، دن رات اس کی فطرت ہے لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے کہ اس کے بسنے والوں نے ان کو یاد رکھا ہو جن کا وقت گذر گیا، ہماری زبان اردو میں تو مثل ہی ہے ''اترا شحنہ مردک نام'' گویا یہ ایک طرح انسانی کمزوری ہے کہ وہ اپنے فائدوں سے قطع نظر کر ہی نہیں سکتا اور اسی لیے اس سے آنکھیں چرا لیتا ہے جس سے کوئی کام بننے کی توقع نہ ہو۔

تغیرات تو کائنات کی فطرت ہیں لیکن ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقلی عام طور پر بتدریج ہوتی ہے اس لیے نگاہیں اچنبھا محسوس نہیں کرتیں بلکہ بعض اوقات تو ارباب بصیرت اسباب وعلل کا ادراک رکھنے کے باعث انقلاب کی پیشگوئی ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے منتظر بھی رہتے ہیں، کم ہی ایسے حادثات ہوں گے جو آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے ہوں، تاریخ اسلام میں ''البرامکہ'' کی داستان عروج وزوال انھیں استثنائی صورتوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

برامکہ کے عروج کا ستارہ عباسی بادشاہ ہارون الرشید کے عہد میں طلوع ہوتا ہے اپنی فیض بار کرنوں سے ضیا باری کرتا ہے اور اسی عہد میں غروب بھی ہو جاتا ہے، اتنے مختصر عرصہ میں یہ تمام منزلیں طے ہوتی ہیں کہ مشاہدہ کرنے والی نگاہیں متحیر رہ جاتی ہیں۔

برامکہ کو تاریخ میں خاص مقام دلانے والی ہستیاں تین ہیں، ایک باپ یحیٰی اور دو بیٹے فضل اور جعفر۔ یہ خاندان پہلے مجوسی تھا، پھر مسلمان ہو گیا، اپنے علم وفضل اور سوجھ بوجھ کے باعث یحیٰی ابن خالد برمک ہارون الرشید کی شہزادگی کے زمانہ میں ہی اس سے متعلق ہو گیا تھا اور ہارون الرشید

☆ یہ مضمون مصنف کی ہمشیرہ فرزانہ قادریہ کے نام سے شائع ہوا تھا۔

نے تخت نشین ہونے پر یحییٰ کو اپنا وزیر اعظم بنا دیا کیونکہ ہارون رشید کی تخت نشینی حقیقت میں یحییٰ کی تدبیر سے ہی ہوئی تھی۔

مہدی نے اپنے بعد اپنے دونوں بیٹوں کو یکے بعد دیگرے ولی عہد مقرر کیا تھا۔موسیٰ الہادی تخت نشین ہوا تو اسے خیال ہوا کہ اس کے بعد ہارون الرشید کی بجائے اس کا بیٹا جعفر ابن الہادی بادشاہ ہو، موسیٰ الہادی نے یحییٰ کو بیس ہزار اشرفیاں دیں اور تخلیہ میں مشورہ کیا، یحییٰ کی دلی تمنا ہارون الرشید کو بادشاہ دیکھنے کی تھی، اس طرح اسے مراتب ملنے کی امید تھی لیکن اس نے موسیٰ الہادی سے گفتگو اس انداز سے کی کہ وہ مطمئن ہو گیا۔

تاریخ الفخری نے وہ الفاظ نقل کیے ہیں جن سے یحییٰ کی ذہانت اور حسن تدبیر کا پتہ چلتا ہے:

یا امیر المؤمنین ان فعلت حملت الناس علی نکث الایمان ونقض العهد ولو ترکت اخاک هارون علی ولایة العهد ثم بایعت لجعفر بعده کان ذلک اوکد فی بیعته.

اے امیر المومنین! اگر آپ یہ فرمائیں گے تو لوگوں کو قسمیں توڑنے اور عہد فراموشی کی جرأت ہوگی اور اگر اپنے بھائی ہارون کو ولی عہدی پر باقی رکھتے ہوئے اس کے بعد جعفر کے لیے بیعت لیں گے تو یہ اس کی بادشاہت کو یقینی بنا دے گا۔

تھوڑے دن بعد پھر بیٹے کی محبت نے زور مارا اور موسیٰ الہادی نے دوبارہ یحییٰ کو بلا کر پھر مشورہ کیا تو یحییٰ نے کہا......

یا امیر المؤمنین لوحدث بک حادث الموت وقد خلعت اخاک وبایعت لابنک جعفر وهو صغیر دون البلوغ. افتری کانت خلافته تصح وکان مشائخ بنی هاشم یرضون ذلک ویسلمون الخلافة الیه.

اے امیر المومنین! اگر آپ کو موت کا حادثہ پیش آ جائے اور آپ اپنے بھائی کو ولی عہدی سے معزول کر چکے ہوں اور اپنے بیٹے جعفر کے لیے جو ابھی نابالغ بچہ ہے بیعت لی ہو تو کیا خلافت صحیح ہوگی اور بنو ہاشم کے بڑے بوڑھے اس پر راضی ہو جائیں گے اور اسے بادشاہت دے دیں گے۔

قال (موسى الهادى) لا

موسیٰ الہادی نے جواب دیا نہیں۔

قـال يـحـىٰ– فـدع هـذا الامـر تـاتيـه عفواً ولولم يكن المهدى بايع لهارون لوجب ان تبايع انت له لئلا تخرج الخلافة من بنى ابيک.

یحییٰ نے کہا تو اس معاملہ کو چھوڑ دیجیے، خود بخود اسے موقع ملے گا۔ اگر مہدی نے ہارون کے لیے ولی عہدی کی بیعت نہ لی ہوتی تو اس وقت آپ پر لازم تھا کہ آپ اس کے لیے بیعت لیں تا کہ خلافت آپ کے باپ کے گھر میں تو رہے۔

موسیٰ کو جعفر کی ولی عہدی کے ارادہ سے باز رکھنا ہارون الرشید کی سب سے بڑی خدمت تھی چنانچہ جب ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید تخت نشین ہوا تو فوراً یحییٰ ابن خالد بن برمک کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور یہیں سے برامکہ کے عروج و اقبال کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکا ہے۔

علامہ طقطقی نے یحییٰ کے متعلق لکھا ہے:

كـان كـاتباً بليغا اديبا شديد اصائب الاراء حسن التدبير ضابطا لما تحت يده قويا على الامور جوادا يبارى الريح كرما وجوداً ممدوحا لكل لسان حليما عفيفا وفوراً مهيبا.

وہ عمدہ کاتب، بہترین ادیب، صائب الرائے مدبر، منتظم، دشواریوں پر قابو پانے والا، بے حد سخی، سب کا ممدوح، بردبار، پاکباز، باوقار اور بارعب تھا۔

اس سے نہ صرف اس کی علمی استعداد کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اچھے خصائل اور اعلیٰ عملی صلاحیتوں کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ اس کے جود و عطا کی تعریف میں ایک شاعر نے کتنے لطیف شعر کہے ہیں۔

لا تـرانـى مـصـافحا كف يحىٰ — انـنـى ان فـعـلـت ضيعـت مـالـى

لـويـمـس الـبـخيل راحة يحىٰ — لسـنـحـت نـفـسـه بـبـذل نـوالـى

تم مجھے یحییٰ سے مصافحہ کرتے نہیں دیکھو گے، اگر میں ایسا کروں تو اپنی دولت برباد کروں گا۔ اگر کسی کنجوس کا ہاتھ یحییٰ کے ہاتھ سے چھو جائے، تو اس کا دل بخشش

فراواں پر آمادہ ہو جائے۔

یحییٰ کی وزارت نے ہارون الرشید کے دور کو ہر اعتبار سے بنو عباس کی حکومت کا بہترین دور بنا دیا تھا۔ اس کی خدمات کا خلاصہ ابن طباطبا کی زبانی سنیے:

فنض یحیٰ بن خالد باعباء الدولة اتم نهوض. سدالثغور وتدارک الخلل وجبی الاموال وعمر الاطراف واظهر رونق الخلافة وتعدی لمهمات الملکة.

یحییٰ نے حکومت کو بے اندازہ ترقی دی، چوکیاں مضبوط کیں، فتنے فرو کیے، محصول وصول کیے، بستیاں بسائیں اور خلافت کی رونق میں اضافہ کیا اور بادشاہت کا بہترین انتظام کیا۔

فضل ابن یحییٰ کو ذاتی فضائل کے علاوہ ہارون الرشید سے یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ اس کا دودھ شریک بھائی بھی تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ابن ابی حفصہ نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے:

کفی لک فخراً ان اکرم حرة   غذتک بثدی والخلیفة واحد

تیرے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ سب سے بزرگ عورت نے تجھے اور خلیفہ کو ایک چھاتی سے دودھ پلایا ہے۔

فضل بھی اپنے جود و نوال میں اپنے باپ یحییٰ کا خلف صدق تھا، اسحاق ابن ابراہیم الموصلی نے ایک کنیز کو تربیت دی تھی اسے فضل کی خدمت میں پیش کیا، فضل نے کہا مصر کے حاکم کا سفیر مجھے تحفہ دینا چاہتا ہے، میں اس کنیز کی طرف اشارہ کر دوں گا، جب وہ تمہارے پاس آئے تو پچاس ہزار اشرفی سے کم نہ لینا۔

سفیر مصر موصلی کے پاس آیا، کنیز کی قیمت دس ہزار دینار لگائی، موصلی نے انکار کیا، اس نے بیس ہزار کہے، اس نے پھر انکار کیا، اس نے تیس ہزار کی بولی لگائی، موصلی میں اب ضبط کی طاقت نہ رہی اور کنیز کو فروخت کر دیا، دوسرے دن فضل نے پوچھا کنیز کتنے میں فروخت کی، موصلی نے بتایا تیس ہزار میں، فضل نے کہا میں نے کہا تھا پچاس ہزار سے کم قبول نہ کرنا، موصلی نے کہا اس کے

تیس ہزار کہنے پر میں طبیعت پر قابو نہ رکھ سکا، فضل مسکرایا اور کنیز واپس کرتے ہوئے کہا روم کے حاکم کا سفیر آئے تو اس سے پچاس ہزار سے کم نہ لینا۔

رومی سفیر نے اسحاق سے قیمت پوچھی، اس نے پچاس ہزار دینار بتائے، اس نے کہا یہ تو زیادہ ہیں تیس ہزار لے لو، اسحاق فوراً راضی ہو گیا، قیمت لے کر کنیز دے دی، دوسرے دن فضل نے پوچھا اور اس نے بتایا تیس ہزار دینار، فضل نے کہا میں نے تمہیں سمجھا دیا تھا، اسحاق نے کہا تیس ہزار سنتے ہی میرے ہوش بجا نہ رہے، فضل نے کنیز واپس کر دی اور کہا خراسان کے حاکم کا سفیر بھی تمہارے پاس آئے گا، پچاس ہزار دینار سے کم نہ لینا۔

خراسانی نے قیمت پوچھی اسحاق موصلی نے پچاس ہزار دینار بتائی، خراسانی نے کہا بہت زیادہ ہیں تیس ہزار لے لو، اسحاق نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا اور انکار کیا خراسانی نے چالیس ہزار لگائے، اسحاق سے ضبط نہ ہو سکا اور فوراً کنیز دے کر قیمت لے لی، پھر فضل نے پوچھا کہو اب کتنی قیمت وصول ہوئی اس نے بتایا چالیس ہزار، بس چالیس ہزار سنتے ہی میرے ہوش و ہواس نے جواب دے دیا، اسحاق نے کہا میں تجھ پر قربان ہو جاؤں ایک کنیز کے ایک لاکھ دینار وصول ہو چکے ہیں، اب اس سے زیادہ کی تمنا نہیں، یہ سن کر فضل نے کنیز کو حاضر کرنے کا حکم دیا اور وہ کنیز پھر اسحاق موصلی کو ہی بخش دی اور اسحاق نے فوراً اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی۔

جعفر بھی اپنے باپ اور بھائی فضل کی طرح ہی سخی اور مدبر تھا، صرف ایک واقعہ اس کی کافی شہادت فراہم کر سکتا ہے۔ جعفر اور حاکم مصر کے تعلقات ناخوشگوار تھے، ایک شخص نے جعفر کی طرف سے حاکم مصر کے نام جعلی خط بنایا کہ ''حامل ہذا میرے مخصوصوں میں ہیں، مصر کی سیر کرنا چاہتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ خاص توجہ کریں''۔ یہ رقعہ لے کر وہ شخص مصر پہنچا۔

حاکم مصر کو اس رقعہ پر تعجب بھی ہوا اور خوشی بھی، اس شخص کو تو عزت سے مہمان بنایا مگر شک رفع کرنے کے لیے وہ خط بغداد میں اپنے نمائندہ کو بھیجا کہ تحقیق کر کے اطلاع دے، وہ اس خط کو لے کر جعفر کے سکریٹری کے پاس آیا، واقعہ سنایا اور شناخت کے لیے پیش کیا، سکریٹری نے وہ خط جعفر کو دکھایا اور تفصیل بتائی، جعفر نے خط دیکھتے ہی پہچان لیا کہ جعلی ہے، پھر اپنے مصاحبوں کو خط دکھا کر اور واقعہ بتا کر ان کی رائے معلوم کی، سب نے خط کے جعلی ہونے کی تصدیق کی اور رائے

دی کہ اس شخص کو سخت سزا دینی چاہیے تا کہ آئندہ کوئی ایسی جرأت نہ کرے۔

جعفر نے مصاحبوں کی رائیں سن کر کہا، سبحان اللہ! کیا تم میں کوئی ایک بھی سمجھ دار نہیں ہے، تمہیں معلوم ہے کہ میرے اور حاکم مصر کے تعلقات خراب ہیں اور کوئی بھی جھکنا نہیں چاہتا تو اللہ کی طرف سے ہی ہے کہ اس نے ایک ایسا شخص پیدا کر دیا جس نے صلح کا دروازہ کھول دیا، اسے سزا نہیں انعام ملنا چاہیے۔ پھر جعفر نے قلم لے کر حاکم مصر کو لکھا ''آپ کو میرے خط میں شک آخر کیوں ہوا، یہ شخص میرا عزیز مصاحب ہے، اس کی خاطر مدارات کیجیے اور جلد میرے پاس بھیجئے میں اس کا مشتاق اور محتاج ہوں''۔

حاکم مصر جعفر کا یہ خط دیکھ کر بہت مسرور ہوا، اس شخص کو تحفے دے کر واپس کیا، جب وہ بغداد پہنچا تو وہ اچھے خاصے مالدار لوگوں میں شمار کیا جا سکتا تھا، وہ شخص جعفر کے پاس حاضر ہوا، زمین بوس ہو کر رونے لگا، جعفر نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا تم آخر ہو کون؟ اس نے جواب دیا میں وہی جعلساز ہوں جو آپ کے احسان سے دبا ہوا ہے، جعفر سمجھ گیا اور پوچھا حاکم مصر نے کتنا دیا، اس نے بتایا ایک لاکھ دینار، جعفر نے کہا اب تم ہماری مہمانی قبول کرو تا کہ رقم دگنی ہو جائے اور خود بھی ایک لاکھ دینار دیے۔

برامکہ کے زوال کے اسباب بظاہر محسوس نہیں ہوتے تھے کیونکہ جعفر کے قتل اور برامکہ کے استیصال تک ہارون رشید کی مہربانیاں برابر قائم تھیں، یہ ضرور ہے کہ برامکہ کی شوکت ان کے حاسدوں کو ابھار رہی تھی اور وہ ہارون الرشید کے کان بھرنے میں کمی نہیں کر رہے تھے مگر عام طور پر کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کا ایسا دردناک انجام ہونے والا ہے۔

ہارون الرشید حج سے واپسی پر حیرہ سے کشتیوں کے ذریعہ انبار چلا گیا اور جعفر سیر و شکار کے لیے نکل گیا، بادشاہ کی طرف سے جعفر کو تحفے برابر پہنچ رہے تھے اور وہ جنگل میں منگل منا رہا تھا، اس کے ندیموں میں بختیسوع طبیب اور ابوزکار مغنی حاضر تھے، دور چل رہا تھا اور ابوزکار گا رہا تھا،

ادھر ہارون رشید نے اپنے خادم مسرور کو حکم دیا کہ فوراً جعفر برمکی کا سر پیش کرے اور اس سلسلے میں دوبارہ ہرگز نہ پوچھے، مسرور فوراً جعفر کی عشرت گاہ کی طرف متوجہ ہوا اور بغیر اجازت لیے ہوئے اندر گھستا چلا گیا، جس وقت مسرور اندر پہنچا ہے تو ابوزکار گا رہا تھا:

فلا تبعد فکل فتی سیأتی عليه الموت يطرق اويغادی

اے محبوب چھوڑ کر نہ جا کیونکہ ہر شخص کے پاس موت آتی ہے خواہ رات میں آ کر دروازہ کھٹکھٹائے یا صبح ہوتے آ جائے۔

جعفر نے مسرور کو اس طرح داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو کہا، امیر المومنین کے خاص خادم کے آنے سے خوشی ہوئی، مگر اس طرح بے اجازت اندر آنا بھلا نہیں لگا، مسرور نے کہا میں جس غرض سے آیا ہوں وہ اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے، امیر المومنین جو چاہتے ہیں اس کی تعمیل کرو۔

جعفر سمجھ گیا اور مسرور کے قدموں میں گر کر کہا ایک دفعہ پھر امیر المومنین سے پوچھ لو انھوں نے شراب کی ترنگ میں کچھ کہہ دیا ہوگا، مسرور نے جواب نہیں دیا، جعفر نے خواہش کی کہ اسے گھر میں جا کر سب سے ملنے اور وصیت کرنے کی اجازت دی جائے، مسرور نے گھر میں جانے کی اجازت نہیں دی، کہا جو وصیت کرنا ہے یہیں کرلو اور اسے گرفتار کر کے رشید کے محل میں لا کر قتل کر دیا۔

مسرور نے جعفر کا سر طشت میں اور دھڑ ایک چمڑے کے فرش (نطع) میں رکھ کر ہارون الرشید کی خدمت میں پیش کیا، ہارون الرشید نے اسی وقت یحیٰی ابن خالد برمکی، فضل ابن یحیٰی اور برامکہ کے تمام لوگوں کے گرفتار کرنے کا حکم دیا اور ان کا نام ونشان مٹا دیا، عام فرمان نافذ ہوا کہ کوئی شخص برامکہ کا نام تک نہ لے اور نہ ان کے اوپر غم کا اظہار کرے، ورنہ وہ بھی سزا کا مستحق ہوگا۔

مؤرخ عمرانی نے بیان کیا ہے کہ اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں، میں ایک دفعہ شاہی دفتر میں گیا تو ایک یادداشت میں نگاہ سے گزرا ''وزیر جعفر ابن یحیٰی کو خلعت شاہی کی قیمت چار لاکھ دینار''، پھر کچھ دن بعد جانے کا اتفاق ہوا تو اسی کے نیچے لکھا پایا، جعفر ابن یحیٰی کی لاش جلانے کے لیے تیل اور بوریہ کی قیمت چار قیراط''۔

☆☆☆

خطیب اور خطبہ☆

قوت گویائی انسان کو اسی لیے ودیعت کی گئی ہے کہ اس سے کام لے کر وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور تمدن و حضارت پروان چڑھے جو حقیقت میں انسانیت کا امتیاز ہے، اس لیے زبان تو گویا انسان کی فطرت ہی ہے اور ادب زندگی کا ساتھی لیکن ادب کی قسموں میں اولیت نثر کو حاصل ہے، کیونکہ وہ آسانی سے بولی جاتی ہے اور بغیر فکر اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔

ادب عربی میں بھی نظم کے مقابلہ میں نثر ہی اولیت کا مقام رکھتی ہے لیکن چونکہ عرب قوم بے اندازہ زمانہ تک کتابت سے بے نیاز تھی اسی لیے عربوں کے قدیمی نثری کارنامے پوری طور پر محفوظ نہیں رہ سکے۔

علمائے ادب نے نثر عربی کی تقسیم یوں کی ہے، امثال، حکم، وصایا، خطب اور وصف، ان میں سے پہلی دو قسمیں اپنے اختصار کے باعث زیادہ زبان زد ہوئیں اور ان کا بڑا سرمایہ بعد میں محفوظ کر لیا گیا، وصایا، خطب اور وصف چونکہ ایک حد تک طوالت چاہتے ہیں، اس لیے وہ مکمل طور پر محفوظ نہ رہ سکے۔

وصایا، خطب اور وصف کا بیشتر حصہ ہمیں نہ مل سکا، مگر وصیتوں، خطبوں اور وصف میں سے خاص خاص حصے جو اُن کے بہترین حصے سمجھے جانے چاہئیں، زبان زد ہوئے اور محفوظ کر لیے گئے جو قدیم نثر عربی کے نمونہ کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

اگرچہ خطبوں کے قدیم ذخیرہ پر ہمیں دسترس حاصل نہ ہو سکی مگر خطیبوں کے اسلوب بیان اور انداز خطابت وغیرہ کے متعلق اکثر باتیں محفوظ رہیں اور بہترین خطیبوں کے نام بھی بھلائے نہ جا

☆ یہ مضمون مصنف کے صاحبزادے جناب عبدالعزیز قادری (مرحوم) کے نام سے شائع ہوا تھا۔

سکے۔ چنانچہ ادب عربی کا طالب علم نہایت اطمینان سے بتا سکتا ہے کہ جاہلیت کے خطیبوں میں سب سے بلند مرتبہ پر یہ لوگ فائز تھے۔ **قیس بن ساعدہ الایادی، عمرو ابن کلثوم التغلبی، اکثم ابن صیفی التمیمی، حارث ابن عباد البکری، قیس ابن زھیر العبسی اور عمرو ابن معد یکرب الزبیدی.**

خطبہ اور وصیت کو ایک ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ ان میں نمایاں فرق یہی ہے کہ خطبہ مجمع عام میں دیا جاتا ہے اور وصیت خاص لوگوں میں کی جاتی ہے لیکن اسلوب کے اعتبار سے دونوں کو ایک سا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ مقصد سمجھانا اور اپنی بات منوانا ہی ہوتا ہے۔

خطیب بھی عرب قبائل کے لیے اتنی ہی اہمیت کا حامل تھا جتنا شاعر تھا بلکہ ایک اعتبار سے خطیب کا مقام کچھ زیادہ ہی بلند تھا کیونکہ اگر کسی وقت نمائندگی کا سوال ہوتا تو ایسے مواقع پر قبیلہ خطیب کو ہی چنتا اور یہ ذمہ داری اسی کے سپرد کی جاتی۔

خطیب عام طور پر کسی بلند جگہ کھڑے ہو کر یا اپنی سواری (اونٹ یا گھوڑے) پر سوار ہو کر خطبہ دیتا، اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے نہ صرف آواز میں اتار چڑھاؤ پیدا کرتا بلکہ اشاروں سے بھی کام لیتا اور اکثر ہاتھ میں لکڑی، نیزہ، کمان یا تلوار رکھتا، ان کا سہارا لیتا اور جوش میں انھیں ہلا ہلا کے ایسے اشارے کرتا کہ سننے والے زیادہ سے زیادہ متاثر ہوں۔

الفاظ عمدہ، عبارت رواں اور خیالات واضح ہوتے، سجع یا قافیہ بندی بہت کم ہوتی اور امثال زیادہ دہرائی جاتیں، کیونکہ وہ پہلے سے سب کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہوتیں، اس طرح اس کی بات میں تاثیر زیادہ ہو جاتی۔

طلوع اسلام کے ساتھ شعر کے مقابلہ میں خطابت کو زیادہ ترقی ہوئی، کیونکہ اسلام کا پیام سب تک پہنچانے کے لیے خطابت سے ہی کام لیا جانا زیادہ مناسب تھا، اسی بنا پر اسلامی خطبا اپنے پیشرو جاہلی خطبا پر بھی سبقت لے گئے۔

جاہلی خطابت اور اسلامی خطابت میں خاص فرق یہ پیدا ہوا کہ اسلامی خطابت میں امثال و حکم کی جگہ قرآنی اشاروں نے لے لی اور اس کی وجہ سے خطبہ کی تاثیر بڑھ گئی۔

دور اسلامی کے خطیبوں میں سب سے اہم شخصیت تو خود صاحب رسالت ﷺ کی ذات ہی

ہے، ان کے خطبات اپنے اندر موعظت اور ادب کے ایسے خزانے رکھتے ہیں جن کا جواب ہی پیش نہیں کیا جا سکتا، خصوصاً وہ خطبہ جو سرور کائنات ﷺ نے حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا عربی خطبوں میں شاہ خطبہ کا درجہ رکھتا ہے۔

ذات فخر کونین ﷺ کے بعد حضرات ائمہ راشدین کا مقام آتا ہے، وہ اپنے وقت کے بہترین خطیب تھے اور ان کے خطبات خطابت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں۔

جب سقیفہ بنی ساعدہ میں امت نے حضرت امام صدیق اکبر کا انتخاب کر لیا اور ان کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت کی جا چکی تو انھوں نے بہ حیثیت خلیفۃ الرسول پہلا خطبہ دیا، یہ خطبہ امت کے اعتماد کا شکریہ بھی ہے اور اس اعتماد کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اپنے عزائم کا اعلان بھی۔

خطب ابوبکر لما بویع بالخلافة. حمد اللّٰہ واثنی علیه ثم قال: ایھاالناس انی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان رائیتمونی علی حق فاعینونی وان رائیتمونی علی باطل فسدوونی. اطیعونی ما اطعت اللّٰہ فیکم. فاذا عصیته فلا طاعة لی علیکم الاان اقواکم عندی الضعیف حتی آخذ الحق له. واضعفکم عندی القوی حتی آخذ الحق منه. اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم.

صدیق اکبر نے خطبہ دیا جب خلافت کی بیعت کی گئی، اللہ کی حمد وثنا کی پھر کہا: اے لوگو میں تمہارا والی بنایا گیا ہوں حالانکہ تم میں سب سے بہتر نہیں، اگر تم مجھے حق پر دیکھو تو میری مدد کرنا، اگر مجھے غلطی پر دیکھنا تو مجھے روک دینا، میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازمی نہیں۔ دیکھو! سب سے کمزور میرے خیال میں سب سے طاقتور ہے کہ میں اس کا حق دلاؤں۔ سب سے طاقتور میرے نزدیک سب سے کمزور ہے کہ میں اس سے حق چھین لوں۔ میں یہ بات کہہ رہا ہوں اور اللہ سے اپنے لیے اور تمہارے لیے مغفرت چاہوں

اور پھر تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اس مرد بزرگ کے الفاظ جس جواں مردی کا اظہار کر رہے تھے

کیسی نا قابل انکار حیثیت تھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خطبہ کے آخر میں مخصوص الفاظ کہتے تھے جن سے سننے والے سمجھ لیتے تھے کہ اب خطبہ ختم ہو رہا ہے۔

اللّٰھم اجعل خیر زمانی آخرہ و خیر عملی خواتمہ و خیر ایامی یوم القاک۔

اے میرے اللہ میری زندگی کا آخری حصہ بہتر بنا دے اور میرے کاموں کا انجام اچھا ہو اور میرا بہترین دن جب میں تجھ سے ملوں۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فتنہ کا سد باب کرنے کے لیے ارباب شوریٰ سے تبادلۂ خیال کے بعد وصال فرمانے سے پہلے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنے بعد امام نامزد فرمایا، اور جب یہ امر عظیم ان کے کاندھوں پر آ گیا تو انھوں نے بھی سنت صدیقی کی متابعت میں خطبہ دیا۔

امام فاروق اعظم کا امت سے یہ پہلا خطاب بہت سی خوبیوں کا حامل ہے، سب سے خاص بات تو یہ ہے کہ اس میں اپنے لائحۂ عمل کی وضاحت کی گئی ہے اور امت سے اطاعت کا عہد لیا گیا ہے مگر کہیں پر بھی یہ نہیں کہا میں یہ کروں گا اور تمھیں اطاعت کرنی پڑے گی۔ اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا میں دعا کرتا ہوں سب آمین کہیں۔ یعنی جو وہ اپنے رب سے مانگیں، سب اس طلب میں شریک ہو جائیں اور پھر دعا میں وہ سب کہہ دیا جو انھیں کرنا تھا۔

خطب عمر اذ ولی الخلافة. حمد اللّٰہ واثنی علیہ. ثم قال: ایھاالناس! انی داع فامنو. اللّٰھم انی غلیظ القلب فلینی لاھل طاعتک بموافقة ابتغاء وجھک والدار الاخرہ. وارزقنی الغلظة والشدة علی اعدائک واھل الدراعة والنفاق من غیر ظلم منی لھم ولا اعتداء علیھم اللھم انی شحیح فسخنی فی نوائب المعروف قصداً من غیر سرف ولا تبذیر ولا ریاء ولا سمعة واجعلنی ابتغی بذلک وجھک والدارالاخرة. اللھم ارزقنی خفض الجناح ولین الجانب للمومنین. اللّٰھم انی کثیر الغفلة والنسیان فالھمنی ذکرک علی کل حال و ذکرالموت

فی کل حین. اللّٰھم انی ضعیف عند العمل بطاعتک فارزقنی انشاط فیھا والقوۃ علیھا بالنیۃ الحسنۃ التی لا تکون الا بعزتک وتوفیقک . اللّٰھم ثبتنی بالیقین والبر والتقوی وذکر المقام بین یدک والحیاء منک وارزقنی الخشوع فیما یرضیک عنی والمحاسبۃ لنفسی واصلاح الساعات والحذر من الشبھات. اللّٰھم ارزقنی التفکر والتدبر لما یتلوہ لسانی من کتابک والفھم لہ والمعرفۃ بمعانیہ والنظر فی عجائبہ والعمل بذلک مابقی انک علی کل شیٔ قدیر.

عمر نے خطبہ دیا جب خلافت انھیں سونپی گئی، اللہ کی حمد وثنا کے بعد کہا: اے لوگو! میں دعا کرتا ہوں تم آمین کہو۔ میرے اللہ! میں سخت دل ہوں، مجھے نرم کردے اپنے اطاعت گذاروں کے لیے تیری خوشنودی اور دار آخرت حاصل کرنے کے لیے۔ مجھے اپنے دشمنوں اور منافقوں کے مقابلہ میں سختی عطا فرمانا۔ جس میں میری ذات کی طرف سے ان پر ظلم وزیادتی نہ ہو۔ اے اللہ مجھے اچھی باتوں میں خرچ کرنے کے لیے اور سخی کردے جس میں غیر ضروری اور بے محل اسراف نہ ہو نہ دکھاوا ہو، اس میں تیری خوشنودی اور آخرت کی بھلائی ہی چاہوں۔ اے اللہ مجھے مسلمانوں کے لیے کشادہ دل اور مہربان بنا دے۔ اے اللہ مجھ میں غفلت اور نسیان بہت ہے مجھے اپنے ذکر کی اور موت کی یاد کی ہر حال میں توفیق دے۔ اے اللہ میں عمل میں کمزور ہوں مجھے اس کی امنگ اور قوت دے اور یہ اچھی نیت اور تیری توفیق سے ہی ممکن ہے۔ اے اللہ مجھے نیکی اور تقوی پر ثابت قدم رکھ اور تجھ سے حیا اور تیرے سامنے حاضر ہونے کی یاد دے مجھے وہ فروتنی عطا ہو جو تجھے مجھ سے راضی کر دے مجھے اپنے نفس کا محاسبہ کرنے، وقت کو اچھائی میں خرچ کرنے اور شکوک وشبہات سے بچنے کی توفیق عطا ہو۔ اے اللہ مجھے اپنی کتاب میں جسے میری زبان پڑھتی ہے تدبر وتفکر اور اس کے معانی اور

عجائب کو سمجھنے اور زندگی بھر اس پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ بیشک تو ہر بات پر
قدرت رکھنے والا ہے۔

حضرت فاروق اعظم بھی اپنے خطبوں کے آخر میں چند مخصوص الفاظ کہتے تھے جو گویا ان کے خطبہ کے اختتام کا اعلان ہوتا تھا۔

اللّٰهم لا تدعني في عمرة ولا تاخذني علي غرة ولا تجعلني من الغافلين.

اے اللہ! مجھے اندھیرے میں نہ چھوڑ، لغزش پر نہ پکڑ اور مجھے غافلوں میں مت بنا۔

جب حضرت فاروق اعظم اس دنیا سے تشریف لے جانے لگے تو امامت و امارت کی امانت آپ نے مجلس شوری کے سپرد کر دی، اس طرح ان کے دامن کو فتنوں کی ذمہ داریوں سے محفوظ رکھنے میں ان کے رب تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی۔

جب ارباب شوریٰ کے مباحث کے بعد حضرت ذوالنورین کو یہ امانت سونپی گئی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی گئی تو وہ بھی خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، مگر شدت تاثر کے باعث حمد وثنا اور شہادت کے بعد صرف دو چار لفظ ہی کہہ سکے۔

ولـمـا ولـي عثمان بن عفان رضي اللّٰه عنه قام خطيبا. فحمداللّٰه واثـنـي عليه تشهد ثم ارتج عيه فقال: ايها الناس ان اول كل امر معب. وسيجعل اللّٰه بعد عسر يسرا.

جب عثمان ابن عفان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ کی حمد وثنا اور رسالت کی شہادت کے بعد زبان رک گئی پھر کہا: اے لوگو! ہر کام کی ابتدا دشوار ہوتی ہے، اللہ تنگی کے بعد آسانی دے گا۔

شہادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تاریخ اسلامی کا وہ المیہ ہے جس سے فتنوں کا دروازہ کھل گیا، امت میں وہ پراگندگی پھیلی کہ اگرچہ زمام حکومت امت کے بہترین فرد کے ہاتھ میں آئی، جو سابقون الاولون میں بھی اسبق کا مقام رکھتا تھا جس کی تربیت دامانِ رسالت میں ہوئی تھی اور جس کی صداقت پر کسی قسم کی حرف گیری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، ان فضائل کے علاوہ وہ امت کا بہترین سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خطیب بھی تھا مگر بے ترتیبی اور غیر صالح عناصر پر اعتماد

کے ہاتھوں انجام کتنا اندوہناک ہوا اس کا اندازہ اس خطبہ سے ہوگا جس میں شکست خوردگی اور جھنجھلاہٹ کی پوری کیفیت موجود ہے اور جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کا شیر دنیاوی گیدڑوں کے ساتھ رہ کر کتنا پشیمان ہے اور اپنے عزائم کے مطابق خدمت نہ کر سکنے نے اس کا دل توڑ دیا ہے۔

قال نافع ابن كليب دخلت الكوفة للتسليم على امير المؤمنين على رضى اللّٰه عنه. فانى جالس تحت منبره وعليه عمامة سوداء وهو يقول. انظروا هذه الحكومة فمن دعا اليها فاقتلوه وان كان تحت عمامتى هذه. فقال له عدى بن حاتم قلت لنا امس من ابى عنها فاقتلوه وتقول لنا اليوم من دعا اليها فاقتلوه واللّٰه ما ندرى ما نصنع بک. وقام رجل احدب من اهل العراق فقال. امرت بها امس وتنهى عنها اليوم. فانت كما قال الاول اكلک وانا اعلم ما انت. فقال على– ابى يقال هذ اصبحت اذكر ارحاما واصره وبدلت منها هوى الريح بالقصب اما واللّٰه لو انى حين امرتكم به ونهيتكم عما نهيتک عنه حملتكم على المكروه الذى جعل اللّٰه عاقبته خيرا اذا كان فيه وكانت الوثقى التى تقلع ولكن متى والى متى اداويكم كانى واللّٰه بكم كناقش الشوكة بالشوكة. يا ليت لى بعض قومى وليت لى من بعد خير قوى. اولئک اخوانى الذاهبون فحق البكاء لهم ان يطيبا رزئت حبيبا على فاقة وفارقت بعد حبيب حبيبا ثم نزل تدمع عيناه. فقلت له ان للّٰه وانا اليه راجعون على ماجرت اليه فقال نعم ان للّٰه وانا اليه راجعون اقوامهم واللّٰه غدوة ويرجعون الى عشية مثل ظهر الحية. حتى متى والى متى حسبى اللّٰه ونعم الوكيل.

نافع ابن کلیب نے بیان کیا ہے میں امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو سلام کرنے کے لیے کوفہ گیا، میں منبر کے نیچے ہی بیٹھا تھا، ان کے سر پر سیاہ عمامہ تھا اور کہہ رہے تھے: دیکھو یہ حکومت ہے جو اس کی طرف دعوت دے اسے قتل کرو خواہ وہ میرے اس

عمامے کے نیچے ہی کیوں نہ ہو۔ تو عدی نے کہا تم نے کل ہم سے کہا تھا جو اس سے انکار کرے اسے قتل کر و اور آج کہتے ہو کہ جو اس کی طرف بلائے اسے قتل کرو۔ خدا کی قسم ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کریں۔ ایک شخص عراق والوں میں سے کھڑا ہوا اور کہا کل تم نے اس کا حکم دیا اور آج اس سے منع کرتے ہو تو تم ویسے ہی ہو جیسا پرانے کہہ گئے ہیں میں جانتا ہوں تم کیا ہو۔ علی نے کہا کیا مجھ سے یہ کہا جا سکتا ہے؟ میں تم سے ایک ہی باتیں کر رہا تھا اور اسے بیان کر رہا تھا اور تم نے اسے گھما پھرا دیا جیسے ہوائیں بانس کی جھاڑی کو۔ خدا کی قسم جب میں نے تمہیں حکم دیا اور جن چیزوں سے روکنا تھا روکا میں نے تمہیں ایسے سخت کام کے لیے ابھارا جس کا انجام اللہ نے اچھا کیا ہے اگر اس میں ہو، وہ مضبوط گرہ تھا جسے توڑا ہی جاتا ہے لیکن کب اور کب تک میں تمہارا علاج کرتا رہوں خدا کی قسم گویا کہ میں کانٹے کو کانٹے سے نکالتا ہوں۔ کاش میری قوم کے کچھ لوگ ہی میرے ساتھ ہوتے اور کاش اپنی قوم کے بہترین لوگوں کے بعد میں نہ ہوتا۔ وہ میرے چلے جانے والے بھائی ہیں ان پر رونا درست ہے اگر اچھی طرح ہو سکے۔ میں نے دوست کا رنج سہا اور ایک دوست کے بعد دوسرا چھوٹا۔ پھر وہ منبر سے اترے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے (نافع) نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون، تم کہاں پہنچے۔ انھوں (علی) نے کہا ہاں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں انھیں صبح میں سیدھا کرتا ہوں شام کو وہ سانپ کی پیٹ کی طرح بل کھائے لوٹتے ہیں، کہاں تک آخر کہاں تک؟ میرے لیے اللہ کافی ہے اور وہی اچھا وکیل ہے۔

یہ وہ خطیب ہیں جنھوں نے اسلامی خطبات کو وہ مقام بخشا جو عربی ادب میں خطابت کو اہم ترین صنف بنا گیا۔ (خطبات کا اقتباس ''العقد الفرید'' سے کیا گیا)۔



مکاتیب ہادی

بنام حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری

ہوالمقتدر

حضرت الشیخ دامت برکاتکم زید مجدکم وبارک اللہ لکم وفیکم

آداب وسلام وقدمبوسی غلامانہ معروض۔

عریضے ارسال کیے ہیں ملے ہوں گے، یا ملیں گے۔ پرسوں جمعہ کی صبح اچانک معلوم ہوا کہ اورنگ آباد والوں نے کل ہی عید منانے کا تصفیہ کیا ہے۔

یہ وبا بہت عام ہوگئی ہے کہ مختلف مقامات میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ عید منانا چاہیے، حالانکہ قدرت نے دن رات بھی ہر جگہ ایک ساتھ نہیں بنائے، اس لیے ساری دنیا میں ایک وقت پر سب ایک کام کر ہی نہیں سکتے۔

علمانے جو کسی جگہ کی بھی شہادت آجانے پر اسے تسلیم کرنے کا تصفیہ کیا تھا اور اختلاف مطالع کو نظر انداز کیا تھا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سفر کے وسائل اتنے بہتر تھے ہی نہیں کہ ایسی جگہ سے شہادت وصول ہو سکے جہاں مطلع بالکل مختلف ہے۔ اب جبکہ آمد و رفت کی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں صرف ان قریبی آبادیوں میں ہی ایک دوسرے کی شہادت ماننا چاہیے جن کا مطلع مختلف نہیں ہے۔ بعض وقت چاند نظر آنے کا امکان صرف چند منٹ ہوتا ہے تو ایسی جگہ جہاں اس وقت غروب ہو چکا ہو کہ مغرب کے مقام میں چاند نظر آنے کا امکان ہو وہ رویت سند نہیں ہو سکتی جو مغربی مقام میں ہوگی خود غیر منقسم ہندوستان کے مشرق و مغرب کے طلوع و غروب میں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ کا فرق ہے تو اگر کسی مغربی شہر میں غروب سے دس منٹ پہلے چاند نظر آئے تو مشرقی شہر میں تو اس وقت تقریباً عشا کا وقت ہو رہا ہوگا، وہاں رویت کیسے مانی جا سکتی ہے۔

بہرحال مجھ پر تو ذمہ داری ہے نہیں، وہ لوگ جو کچھ بھی نہیں جانتے ذمہ دار ہیں، میں تو **وارکعو مع الراکعین** میں ہوں۔

سب پر سلامتی اور بس

ہمیشہ محتاج وطالب دعا خاص

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۶/۸/۱۸ء

هوالمقتدر

بملاحظہ عالی میرساند

پرسوں عریضہ تحریر کیا ہے، دیر میں ڈالا گیا ہوگا۔ کل اتوار تھا اس لیے غالباً آج روانہ ہوگا۔

طرح روانہ کی ہے یہ میری یاد کا غالباً پہلا مشاعرہ تھا، میرا مکتب ہو چکا تھا یعنی غالباً محرم ۱۳۳۶ھ میں

''بہار آئی ہے اے پیر مغاں پھر دورِ ساغر ہو''
ق ر

سب کی غزلیں ہوں گی، مولانا راغب کی غزل کلیات میں ہے۔ چچا مفتی ابوالحسن قادری کی غزل برسوں بعد ان سے پھر سنی تھی۔ اب میں طرح میں شعر کہہ رہا ہوں۔

آپ کے دسیوں مرید آتے ہیں، ملتے ہیں اور پوچھتے ہیں تم ہمارے پیر صاحب کے بھائی ہو، کیسے کیسے سمجھاؤں؟

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامؔی　　　　که دریں راه فلاں ابن فلاں چیزے نیست

مناسب یہ ہے کہ آپ بھائی جان کہنا بند کریں اور ''قادری مُلّا'' کہیں تو لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔ قدیم اعتبار سے تو مُلّا ہو نہیں سکتا، اس کے لیے تو بحر العلوم سے رشتہ مضبوط ہونا چاہیے۔ بعد میں وہ مولوی کی کمتر قسم کے لیے بولا جانے لگا، اس میں مضائقہ تو نہیں کہ بہر حال مدرسہ قادریہ سے نسبت تو ہے ہی۔

ایک بات اور کم سے کم ''**المعتقد المنتقد**'' کی تصحیح ہاتھ سے کر دیجیے **معتقد المنتقد** چھپا ہے۔ یہ ترکیب ہو ہی نہیں سکتی۔ ''ال'' معتقد پر لکھ دیجیے کہ مرکب توصیفی ہے۔

سب پر سلامتی اور بس۔　　　　ہمیشہ محتاج وطالب دعا

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۶/۶/۳۰ء

پس نوشت :- یاد آیا کہ حضرت ابراہیم میاں رحمۃ اللہ علیہ مجھے ملا جیون فرماتے تھے، بس یہی ٹھیک ہے۔

ہوالمقتدر

حضرت الشیخ دامت برکاتکم زیدمجدکم و بارک اللہ لکم و فیکم

آداب وسلام وقدمبوسی غلامانہ معروض۔

ہرحال میں اللہ کا شکر ہے۔ آپ کی دعا کی برکت سے سب خیریت ہے۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور سب مع الخیر۔ عریضہ لکھ چکا ہوں، مولانا سلمہ کی خیریت معلوم ہونے کا انتظار ہے۔

کل شام اورنگ آباد گیا تھا، قافلہ کے ساتھ عائشہ سلمہا بھی جارہی تھیں، شام کو واپس آ گیا۔ وہاں اکرام میاں صاحب نے سنایا کہ انور میاں صاحب کا کہنا ہے کہ مدرسہ میں طلبا کے لیے بہتر سے بہتر کھانے کا انتظام کیا جائے۔ میرے سرکار مقتدر قدس سرہ نے بڑی باتوں کو منع فرمایا ہے، بہتر سے بہتر پڑھائی ہو مگر فقیری سے رشتہ نہ ٹوٹے۔ میں نے مولانا احمد دین صاحب کو دیکھا ہے لکڑی ٹیکتے دروازہ پر جاتے تھے، صدا لگاتے تھے، ''بڈھے مولانا کا کھانا''، بی پھپو پیالے میں دال اور چار چپاتیاں تھما دیتیں، وہ لیے ہوئے آتے اور مسجد کے حجرہ میں کھاتے۔ یہ مولانا حضور تاج الفحول سے صرف ایک سال چھوٹے تھے، ''احمد اغر'' تاریخی نام تھا، آخر تک اپنا کھانا مانگتے تھے جو حضور سیف اللہ المسلول نے مقرر کیا تھا۔

درگاہ قادری میں لنگر گوشت روٹی قدیم ہے، چچا ستار بخش وغیرہ نے سرکار سے عرض کیا کہ کھانا اعلیٰ ہونا چاہیے، اجازت ہو تو ہم کریں۔ فرمایا ''مجھے کیا اعتراض ہے، مگر کر نہیں سکو گے''۔ صرف ایک سال پلاؤ زردہ پکا، پھر سویرا۔ یہ روایت چچا مفتی کرم احمد نے سنائی تھی۔

میں تو اس خیال کا آدمی ہوں کہ مدرسہ قادریہ، آستانہ قادری اور زیب سجادہ سب ایک دوسرے میں مدغم ہیں، تفریق مناسب نہیں۔ پڑھنے پڑھانے پر زور دینا چاہیے، کھانے اور دکھاوے پر نہیں، واجب تھا عرض کیا۔ یہ بوڑھا غریب الدیار ضبط سے محروم ہو چکا ہے ورنہ اسے دخل در معقولات کا حق تو نہیں، وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب واتوب الیہ وھو التواب الرحیم۔

سب پر سلامتی اور بس

ہمیشہ محتاج وطالب دعائے خاص

گدائے خاک نشیں

۱۶/۷/۱۹۸۷ء

حضرت الشیخ دامت برکاتکم زید مجدکم وبارک اللہ لکم وفیکم

آداب وسلام وقدمبوسی غلامانہ معروض۔

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔امید کہ مزاج سامی بخیر ہوگا اور اہل بیت مع الخیر ہوں گے۔

عریضہ لکھ چکا ہوں، منی آرڈر بھی روانہ کردیا ہے۔

کئی روز سے سوتے جاگتے اقبال علیہ الرحمہ کا ایک شعر دماغ میں ہلچل مچائے ہوئے ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

کہنے کو یہ ایک شعر ہے مگر حق و باطل کی آویزش کی ایک مفصل تاریخ اس میں سموئی ہوئی ہے۔

''ازل'' تو زمانہ سے ماوراء ہے، اسے تخلیق آدم سے ہی شروع کریں تب بھی **کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین** سے معلوم ہوتا ہے کہ چراغ مصطفوی اس وقت بھی روشن تھا۔ابلیس کا سجدہ سے انکار، اللہ سے انکار نہیں تھا، رسول اور اس کی عظمت سے انکار تھا اور اس سے وہ راندۂ درگاہ ہوا، یعنی اللہ کے ساتھ رسول پر ایمان اور اس کی عظمت کے سامنے سر جھکانا بھی ضروری ہے، یہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں۔

اسلام تو سارے انبیاء و رسل کے ذریعہ ہدایت کرتا رہا ہے اور ابلیس بھی اپنے **لاُغْوِیَنَّھُمْ** کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے ستیزہ کار رہا ہے۔

بعثت خاتم المرسلین ﷺ کے ساتھ ہی حق و باطل کی آویزش تاریخ کے سامنے ہے۔ ہر طرح شیخ نجدی ندوہ کی مجالس میں مشورہ دیتا رہا مگر جن دلوں میں اسلام نے گھر بنالیا ان پر کوئی سختی کارگر نہ ہوئی اور ہجرت کے بعد دارالامن میسر آگیا۔

باطل نے حق کو مٹانے کے لیے حرب وضرب کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ایک اور محاذ بھی کھول دیا۔نفاق زیادہ خطرناک ہے اس کے بعد سے منافقین نے نئی نئی تدبیریں کرنی شروع کردیں۔

صاحب وحی تو سب جانتے ہی تھے ان سے کون چھپ سکتا تھا، انہوں نے جو جماعت پیدا کی اسے بھی نگاہ مرد مومن عطا فرمائی، اس سے بھی کوئی چیز چھپ نہیں سکتی تھی۔حضور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے ''میں اس وادی میں خطاب کے اونٹ چراتا تھا، کام نہ کروں تو تھکا دیتے تھے، کوتاہی پر مارتے تھے اور آج اس وادی میں رات اس طرح گزاری ہے کہ میرے اور

اللہ کے درمیان کوئی نہیں (وما بینی و بین اللہ احد.) اللہ اکبر کس مقام کا اظہار فرمایا۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ابلیس نے ایک نئی تدبیر اختیار کی، تشیع کی تخم کاری کی، اسلامی جمعیت کو اپنے پرائے کے نفسیاتی حربے سے پراگندہ کیا، اسلام تو مسلمانوں کو ایک خاندان بناتا ہے۔ ''اخوۃ'' مگر علی اور عثمان کو ماننے والے تقسیم ہو گئے، مگر بڑے مزے کی بات ہے سبط اکبر نبی کا نام شیعان عثمان میں آتا ہے، وہ امت کو انتشار سے محفوظ رکھنے والا تھا۔ اب فرقے پیدا ہونے لگے رافضی انھیں میں سے، پھر خارجی، ظاہری، باطنی وغیرہ کہاں تک گناؤں، وہابی اور قادیانی بھی سب شیطانی کاروائی ہے، وہی

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

کام بہت بڑا ہے۔ رد بدمذہباں کی کتب ہوں، معین بھائی جیسا قلم والا ساتھ ہو تو میں املا کراتا جاؤں اور وہ خود بھی لکھتے جائیں مگر یہ سب کیسے ہو؟

سب پر سلامتی اور بس

ہمیشہ محتاج و طالب دعا

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

یکم اگست ۱۹۹۰ء

ہوالمقتدر

حضرت الشیخ دامت برکاتکم زید مجدکم و بارک اللہ لکم وفیکم

آداب وسلام وقدمبوسی غلامانہ معروض۔

اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی دعا کی برکت سے سب خیریت ہے امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور سب مع الخیر ہوں گے۔

بعد انتظار شدید آج ۶/۱۵ کو ۶/۱۳ کا لکھا ہوا والا نامہ ملا۔ اس سے پہلے کوئی خط نہیں ملا جن کا اس خط میں تذکرہ ہے، صرف صاحبزادہ سلّمہٗ کی خوشخبری ملی تھی۔

مجھے معلوم نہیں کہ عقیقہ اور نام رکھنے کے تعلق کی اصل کیا ہے۔ بہر حال یہ مروج ہے مگر ترمیم تو

ہو ہی سکتی ہے جیسا کہ میرے ساتھ ہوا کہ ''محمد'' نام رکھے جانے کے بعد زبردستی عبدالہادی ٹھونس دیا گیا جس سے عربی قاعدہ میں محمد بن عبدالہادی ہو گیا جو سراسر غلط ہے۔

''عطیف'' بہت اچھا نام ہے (مہربان) اچھی صفت ہے مگر ''محمد عطیف'' عربیت کے خلاف ہے یا تو اس کا معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنا نام تبدیل کر لیا ہے اور یہ محمد بن عطیف ہیں کیونکہ عطیف محمد کی صفت ہو نہیں سکتی وہ معرفہ یہ نکرہ۔ ہاں محمد العطیف کہلائیں تو ٹھیک ہے مگر یہ ترکیب اس طرح بولی نہیں جا سکتی اس لیے یا تو نام صرف محمد یا صرف عطیف صحیح ہوگا۔ امام غزالی تو کئی پشت تک محمد بن محمد تھے۔

صارمؔ تخلص آپ کو پسند آیا، مگر عطیف کے ساتھ اس کا میل نہیں، عطف کی نرمی صرم کی شدت کیسے برداشت کرے گی اس لیے میرے خیال میں یہ تخلص آئندہ کے لیے محفوظ رکھیے۔ انھیں بَسّام کا تخلص دیجیے کیونکہ عطیف فعیل صفت مشبہ ہے اس لیے وہ دوام یا مبالغہ چاہتی ہے، ''باسم'' سے بات نہیں بنے گی، مہربانی اور خندہ پیشانی میں خاص ربط ہے ہی جو ظاہر ہے۔

میری طرف سے سب کی خدمات میں آداب وسلام، دعا اور پیار، زیادہ بجز طلب دعاے خاص کیا تحریر کروں۔

ہمیشہ محتاج وطالب دعائے خاص

محمد عبدالہادی القادری

۸۲/۶/۱۸ م

ہوالمقتدر

بملاحظۂ عالی

کل ایک عریضہ طالب علمانہ حاضر کیا ہے۔ کیسا ہی ناقص سہی مگر ہوں مدرسہ قادریہ کا طالب علم۔

آج صاحبزادی حمیدہ سلمہا کا خط ملا۔ انھوں نے تحریر کیا ہے کہ صارم نام ہمیں پسند آ گیا۔ ان سے نکتہ سنجی نہیں کر سکتا۔

یاد آ گیا کہ ابونواس نے ایک شعر کہا، ایک لفظ غیر مانوس غیر واضح ترکیب میں استعمال کیا، اس پر بحث شروع ہو گئی کہ ابونواس بصریوں کی پیروی کرتا ہے، کسی نے کہا غلط یہ تو صاف کوفیوں کا

استعمال ہے۔ لوگوں نے سوچا ہم خواہ مخواہ لڑ رہے ہیں، شاعر موجود ہے کیوں نہ اسی سے پوچھ لیں، ابونواس نے کہا میرا کام شعر کہنا ہے دلیلیں دینا تمہارا کام ہے، جاؤ خوب لڑو۔

اور ایک شاعر کا شعر سن کر کوئی نالائق طالب علم مدرسہ کے انداز میں گفتگو کرنے لگا، کسی نے شاعر کو سنایا کہ مدرسہ میں تمہارا شعر موضوع بحث بنا ہوا ہے، شاعر نے کہا ''شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد''۔ غرض کہ جب صاحبزادی سلمہا پسند کر چکی ہیں تو کچھ نہیں کیا جا سکتا حالانکہ یہ تو اُردو شاعر نے ہی کہا تھا

میں ہوں ہنوز اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

مگر ساری باریکیاں اس لیے لغو ہیں کہ انھیں کون سمجھے گا؟ کون سمجھائے گا؟

بارک اللہ لھم اجمعین.

میری حالت اور حالات سب آپ پر عیاں ہیں۔ زیادہ مجال عرض نہیں۔

سب کی خدمات میں آداب وسلام، دعا اور پیار

ہمیشہ محتاج وطالب دعائے خاص

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۲/۶/۱۹ء

بنام حضرت عبدالمجید اقبال قادری

ہوالمقتدر

زاویہ قادریہ
نام پلی حیدرآباد (دکن)

جان برادر حفظکم اللہ ومجدکم وبارک لکم وفیکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مُلّا صاحب(۱) کے مسودات مولوی عبدالرحیم صاحب نے مجھے بھیجے تھے میں نے رکھ لیے تھے، کثرت کار کے باعث فوراً دیکھ نہ سکا تھا۔ بدایوں میں انھوں نے مجھ سے تو کچھ دریافت نہ کیا مگر شیخ سے پوچھا کہ میں مسودات ساتھ لایا یا نہیں اور جب شیخ نے بتایا کہ ابھی انھوں نے دیکھے ہی نہیں ہیں تو انھوں نے اظہار تعجب کیا کہ اس کے مطالعہ میں اتنی دیر لگائی۔ شیخ نے مجھ سے یہ گفتگو لوٹا دی، مجھے حیرت ہوئی کہ مجھ سے مطالعہ اور عجلت کی امید باندھی، حالانکہ میں تو طالب علم ہوں تنقید و تنقیح میرا کام ہے۔ خیر، اب اس کا سرسری مطالعہ جگہ جگہ سے کیا۔ پہلا تاثر تو یہ رہا کہ یہ کام ملا صاحب کو خود ہی ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا کیونکہ لیڈری اور واعظی سے تصنیف و تالیف کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ ان کے قلم میں نہ روانی ہے نہ یکسانیت، مگر یہ تلخ بات لکھتے ہوئے طبیعت ڈر رہی تھی کہ خواہ مخواہ انھیں سچی بات سے ملال ہوگا اور ممکن تھا کہ ابھی بہت دن اسی شش و پنج میں گزر جاتے کہ کیسے لکھوں؟ جھوٹ بھی نہ ہو اور برا بھی نہ معلوم ہو۔ مگر اتفاق سے اس وقت کے مطالعہ میں مجھے اپنی ذات سے متعلق پڑھنے کا موقع ملا جس کے بعد میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ مدرسہ قادریہ کے محتسب نعت میں بھی گرفت فرماتے تھے اور ایک لفظ بھی حدودِ نعت سے زیادہ برداشت نہ کرتے تھے اور مُلّا صاحب بے وجہ میری شان میں قصیدہ مدحیہ فرما رہے ہیں اور وہ بھی سراسر دروغ بے فروغ لاحول و لا قوۃ الا باللّٰہ۔ وہ کہ عربی نثر بھی بلا تکلف فی البدیہ نہیں لکھ سکتا ''وہ قصائد کہتا ہے جنھیں سن کر فصحائے عرب دنگ رہ جاتے ہیں''، استغفر اللّٰہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ. جب ذرا سی تمہاری خوشنودی کے لیے تمہارے بھائی کی جھوٹی تعریف کی جا سکتی ہے تو سیرت نگاری کا معیار معلوم، اللّٰھم احفظنا.

۱۔ ملا عبدالصمد مقتدری بدایونی نے حضرت عاشق الرسول کی سوانح تالیف کی تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (اسید الحق)

ان سے میری طرف سے معافی مانگتے کہ میں ان کے معیار کے مطابق نہ ادیب ہوں اور نہ محقق اور نہ ایسا خوش عقیدہ کہ ان باتوں پر بھی ایمان لاؤں جو میرے علم میں میرے مدرسہ کی روایات کے خلاف ہیں۔

اب اس سلسلہ میں زحمت اٹھانا میرے خیال میں وقت کی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ اگر آپ کو صرف لفظوں کا گورکھ دھندا ہی چاہیے تو میں بیک جنبش قلم اس سے زیادہ کاغذ سیاہ کردوں گا، مگر اس سے حاصل؟ میں نے اسی لیے تذکارِ محبوب میں یہ استدعا شائع کرائی تھی کہ جو صاحب بھی کوئی خاص معلومات رکھتے ہوں وہ شیخ کو بھیج دیں اور تمام مواد جمع ہو جانے پر آپ کا یہ خادم اس کی تنقیح کرے اور اس میں جو باتیں کسی طرح بھی قابل ذکر ہوں انھیں مختلف عنوانوں کے تحت ترتیب دے مگر وہ گزارش صدا بہ صحرا ہوئی اور اگر کسی نے اپنی معلومات بھیجی بھی تو وہ ملا صاحب نے اپنی تالیف میں شامل فرمائیں۔

پھر میں نے آپ کو لکھا کہ پاکستان میں مختلف حضرات سے ان کے تاثرات مانگیے۔ ان میں سے صرف سیدی زین کا نہایت عمدہ مضمون ملا جس کا ترجمہ معین بھائی نے بہت ہی خوب کیا ہے۔ اس مضمون سے چند باتوں کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، حضرت اقدس کا ادب عربی پر عبور، قوت حافظہ، بدیہہ گوئی، بذلہ سنجی، تیز ادراک اور ان کی ایمان افروز تلقینات۔

میں نے تو بہت سے لوگوں کے نام بھی آپ کو لکھے تھے، جو سب مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈال سکتے ہیں۔ سید طاہر علاء الدین گیلانی کا خط ان کی ہی زبان عربی میں انھیں کے ہاتھ کا ہونا چاہیے۔ بہت مشکل ہے کہ کوئی مبسوط چیز عرس سے پہلے تیار ہو سکے، مگر چند تاثرات اور ان کی تشریحات تو مرتب ہو ہی سکتی ہیں۔

انشاء اللہ یہ قرض باقی نہیں رہے گا اور مدرسہ اور اس کے اکابر سے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جائے گا اور وہ یہ کام اپنے ہی قلم سے لے لیں گے، آپ بھی دعا کیجیے کہ جلد توفیق رفیق ہو۔

حضرت شیخ کی ہم رکابی کی برکت ہے کہ سرکار سلطان الہند غریب نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دربار میں مناقب پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی اور شیخ کے پہلو میں کھڑے ہو کر مواجہہ میں فاتحہ کے ساتھ پیش کیے گئے۔

فالحمدللہ،آپ بھی پیش کردیجیے اور دعا کیجیے اللہ مجھے برکات دے(''مجھے''میں بھی آپ،شیخ اور سب کو میں شامل سمجھتا ہوں کہ علیحدہ تو میرا کوئی وجود ہے ہی نہیں)۔

مفصل خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیے،سب پر سلامتی،

تمہارا بھائی جان

ہادی القادری

۶۱/۱/۴ء

ہوالمقتدر

جان برادر مولانا حفظکم اللہ وبارک اللہ لکم زیدمجدکم...... سلامتی رحمت اور برکات

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔خیریت ہے۔

کل فکری صاحب کے نام آپ کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ بلدہ آنے کا ہے، حماد قادری صاحب سلمہ بہت خوش ہیں کہ آپ آنے والے ہیں۔اس وقت وہ نئے ڈاکٹر صاحب کو دکھانے نظام آرتھوپیڈک ہاسپٹل پنجہ گستہ گئے ہیں۔کیا ٹھیک کہ کرشمۂ غیبی کے ظہور کے لیے ان ڈاکٹر کا علاج بہانہ بن جائے۔

فرید سلمہ نے صاحبزادے کی شان میں نثری قصیدہ لکھا ہے جو جذبات کی فراوانی کا آئینہ دار ہے۔طول طویل نام لکھ کر خواہش کی ہے کہ میں آگے پیچھے اور اضافہ کردوں۔پہلے ہی نام بہت طویل ہوگیا ہے اس میں میری مداخلت زائداز ضرورت ہے۔

نام کے سلسلہ میں عربی معمول یک لفظی ہے یا اضافہ میں کنیت کا رواج ہے۔دو دو نام ایک کے لیے غیر عربی ہے۔

ایک لطیفہ سنو حضرت اقدس نے بصرہ سے پیر شمس الدین علیہ الرحمہ کو تار دینے کے لیے کہا، میں نے تار دے دیا اور آخر میں بھیجنے والے کا نام ہندوستانی طرز پر محمد عبدالقدیر قادری لکھا۔تار پہنچنے پر عبدالقادر شمس الدین نے کہا''مولوی کیوں نہیں آرہا؟''پیر شمس الدین نے کہا''وہی آرہا ہے''، مگر وہ ماننے کو تیار نہ تھے اور کہتے تھے تار تو محمد کا ہے،مولوی کا تو کہیں ذکر نہیں۔تو معلوم ہوا کہ یہ

طریقہ بھی عربیت کے خلاف ہے کہ ہر نام کے ساتھ محمد کا اضافہ کیا جائے۔

آپ کے صاحبزادگان کی پیدائش کے وقت نام تجویز کرنا میرے سپرد تھا۔ چنانچہ فرید اور مؤید میرے ہی رکھے ہوئے نام ہیں جنھیں حضرت اقدس نے پسند فرمایا اور یہی نام رکھے گئے۔ میں اس امر کی تصدیق یا تردید کچھ نہیں کرسکتا کہ حضرت اقدس نے عبدالرب نام تجویز کیا تھا مگر رکھا نہیں گیا۔ حدیث میں آیا ہے کہ اچھے نام وہی ہیں جن میں عبدیت یا حمد ہو (دونوں نہیں۔''او'' یا کے معنیٰ میں آتا ہے) محمد، احمد، محمود، حماد، حامد، حمید، حُمید (تصغیر) سب کا تعلق حمد سے ہے، اس سلسلہ میں خالص عرب حمد اور حمدان بھی نام پسند کرتے ہیں۔

دوسرا لفظ باپ کا نام ہوتا ہے اس لیے احمد اقبال درست نہیں، احمد فرید اقبال قادری ہونا چاہیے، تیسرا لفظ دادا کا نام اور چوتھا نسبت۔

اگر آپ کو اچھی طرح یاد ہے کہ مؤید کے لیے عبدالرب حضرت اقدس کی تجویز تھی تو اصولاً یہ نام مؤید سلمہ کے بیٹے کا ہونا چاہیے جیسا کہ قرآن میں ہے''ہم نے اسحٰق کی بشارت دی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی''۔ یعقوب اسحاق کے بعد سیدنا ابراہیم کے لڑکے کی بشارت نہیں، اسحاق کے بیٹے کی بشارت ہے۔ مؤید کے سلسلہ میں عبدالرب بھی اسی قسم کی بات ہوسکتی ہے۔

ویسے یہ نام عبدیت سے متعلق ہونے کے باعث پسندیدہ ہے مگر حمد سے تعلق رکھنے والے نام کے ساتھ غیر ضروری ہے''او'' کے معنی تو یہی ہیں۔

بہرحال جو نام بھی آپ سب کو پسند ہو وہ صحیح ہے مگر ہوگا وہی کہ صاحبزادے ''احمد'' کہلائیں گے اور پھر کسی کے لیے عبدالرب خالی رہے گا۔

خواجہ میاں صاحب پوتے کے نام کے لیے مُصر ہیں مگر میں گریز کر رہا ہوں کیونکہ جہاں کئی کئی ناموں کا رواج ہو وہاں میرا کوئی نام تجویز کرنا بے کار ہے۔

خواہ مخواہ قلم چل پڑا، بسکٹ، پیڑے، پیڑی کی بات لکھنا تھی اور بس۔ بلدہ آتے وقت ضرور ساتھ لیتے آئیں۔

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۱/۹/۸۱ء

بنام مفتی عزیز احمد قادری بدایونی ثم لاہوری

ہوالمقتدر

مکرم ومحترم ذوالمجد والکرم استاذ معظم مدظلکم العالی وزید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ وہدیۂ آداب ونیاز پیش خدمت ہے۔

الحمدللہ کہ آپ کے اس حقیر وپرتقصیر تلمیذ کو عرس قادری (شوال المکرّم) کے سلسلہ میں آستانۂ قادریہ مجیدیہ پر حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔

برادر محترم حافظ لطافت علی صاحب قادری مقتدری مع اپنی سدا بہار جوانی شرکت عرس کے لیے رُکے ہوئے تھے، ان سے مل کر خوشی ہوئی۔

انھوں نے آپ کی خیریت سے مطلع کیا اور اگر یاد رہا ہوگا تو آپ کی خدمت میں اس احقر خدامِ آستانہ کا سلام بھی پہنچایا ہوگا، بارک اللہ لہم۔

حضرت شیخ زیب سجادۂ آستانۂ قادریہ مجیدیہ دامت برکاتہم نے تفسیر عباسی کا جدید مطبوعہ نسخہ مجھے عطا فرمایا اور فرمایا ''دو نسخے ملے ہیں، غالبًا ایک مدرسہ قادریہ کے لیے اور دوسرا تمہارے لیے ہے کہ نمبر ایک تلمیذ ہو''۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ تلمیذ نمبر ایک کیا ہوتا ہے۔

تفسیر عباسی (ترجمہ اردو) اور ترجمہ قادری اپنے ساتھ حیدرآباد لیتا آیا۔ انشاء اللہ تفصیلی مطالعہ کروں گا اور ایمان تازہ ہوگا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

مجلد سامنے ہے، کھولنے سے پہلے خیال آیا کہ استاذ مدظلہم کے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہیں بلاغت اور صنائع بدائع سے واقف، ورنہ ایک عامی تو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ لف ونشر مرتب کس چڑیا کا نام ہے اور پھر تفسیر ابن عباس سے پہلے ''ترجمہ اُردو'' محذوف ہے، یقیناً سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اُردو نہیں آتی تھی، انھوں نے تفہیم قرآن لغت ضاد میں ہی کی ہوگی اور ہم جیسے اُردو خوانوں کے لیے سرکار صاحب اقتدار قدس سرہ نے اسے اُردو میں منتقل فرمادیا کہ ترجمان القرآن رضی اللہ

عنہ سے استفادہ کرسکیں۔

تفسیر ابن عباس کے نیچے ''بمعہ'' تو میری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، ''ب'' خود ''مع'' کے معنیٰ میں آتی ہے، یہ ''مع مع'' کیا ہوا؟ میرے خیال میں آئندہ طباعت میں تصحیح فرمائی جائے۔

القران المجید

مع

ترجمہ قادری

از

حضرت مولانا مفتی عزیز احمد قادری مقتدری صاحب مدظلہم العالی

برحاشیہ

تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہما

اُردو ترجمہ

از

حضرت مولانا عبدالمقتدر مطیع الرسول قادری بدایونی قدس سرہٗ

بہر حال یہ ایسی فروگزاشت ہے جس پر عام طور پر توجہ نہیں کی جائے گی، مگر مدرسہ قادریہ کا بوریہ نشین اور آپ کا ناقص شاگرد تو اسے مناسب نہیں سمجھتا کہ کوئی انگشت نمائی کا موقع فراہم کیا جائے اور وہ بھی کسی خام کار کی طرف سے نہیں، ایک فاضل اجل کی طرف سے جو میرا استاذ اور محقق مفتی ہے، میری نگاہ تصور میں ہنوز وہ مناظر تازہ ہیں۔

(۱) حضرت اقدس ابی قدس سرہ کو حیدرآباد میں خبر ملی کہ استاذی حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمہ کا انتقال ہوگیا۔ حضرت اقدس قدس سرہ نے انتہائی تاثر میں فرمایا ''آج مدرسہ قادریہ سے فقہ ختم ہوگیا''۔

(۲) عرس قادری (محرم الحرام) کے لیے بدایوں تشریف آوری ہوئی، آپ کو یاد فرمایا اور کہا ''عزیز احمد! مولانا حبیب الرحمٰن کے بعد فتاویٰ کون لکھے گا؟'' پھر فرمایا ''تم یہ کام کرو''۔

(۳) سال بھر بعد پھر عرس قادری (محرم الحرام) میں تشریف آوری ہوئی، آپ کو یاد کیا، کوئی مسئلہ (مسئلہ یادنہیں رہا) پوچھا، آپ کے جواب پر خوش ہوئے، پھر مجھ سے فرمایا ''الحمدللہ عزیز احمد نے محنت کی، ابھی مدرسہ قادریہ سے فقہ نہیں اٹھا'' نہ جانے کیا کیا یاد آنے لگا

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

سرورق میں ہی الجھ کر رہ گیا، کتاب کھولوں اور کہوں ؎

ہر گام نیا طور نئی برق تجلی　　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

(فانیؔ)

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ ''عرض ناشر'' سے جو مضمون شروع ہوا ہے اور ''محمد عبدالحکیم شرف قادری'' پرختم ہوا ہے، اس میں ذیلی عناوین بھی ہیں اور دوجگہ آپ کے دستخط ''فقیر عزیز احمد قادری'' اور ''فقیر سراپا تقصیر عزیز احمد قادری بدایونی ثم لاہوری'' ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں زیادہ روانی سے لکھ سکتا تھا، اب جبکہ آپ کے دستخط ہیں نہایت ادب سے بعض اصولی باتیں کروں گا جن سے اختلاف شاید انا ولاغیری کے بدمست بھی نہ کر سکیں۔

حضور سیف اللہ المسلول کا سنہ وصال آپ نے میلادی (عیسوی) لکھا ہے۔ میرے پاس ایسی تقویم ہے نہیں جس سے سنہ میلادی وسنہ ہجری کی مطابقت کروں، درگاہ قادری میں جو تواریخ وصال لگی ہوئی ہیں ان کا اختتام ''المؤرخ عبدالقادر'' پر ہوتا ہے جس سے ۱۲۸۹ھ معلوم ہوتا ہے، آپ خود ہی دیکھیں اور مطابقت کرلیں۔

سرکار صاحب اقتدار قدس سرہٗ کے تلامذہ کی فہرست میں تقدیم وتاخیر کا خیال نہیں رکھا گیا۔ پہلے دور میں مفتی محمد ابراہیم، مفتی حسین احمد، مولانا عبدالمجید اور سید احمد حسین جیلانی یہاں ان کے ساتھی تھے۔ آکا (ماجد میاں)، مولانا راغب، مفتی صدیق، مولانا قدیر بخش دوسرے دور کے ساتھی تھے۔ مولانا مفتی حبیب الرحمٰن اور ان کے ساتھی تیسرے دور میں آتے ہیں۔ حضرت اقدس قدس سرہٗ چوتھے دور میں آتے ہیں۔ مولوی جمیل احمد، سید حسن، ستاری بھائی وغیرہ علیہم الرحمہ اور آپ خود آخری دور میں آتے ہیں۔

سرکار رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سید شاہ مصباح الحسن مودودی علیہ الرحمہ کا نام غلط ہے، ہاں وہ مولانا مفتی محمد ابراہیم علیہ الرحمہ کے شاگرد ہیں لہٰذا سرکار سے بالواسطہ شاگردی ہے، براہ راست نہیں۔ مولانا مفتی محمد ابراہیم علیہ الرحمہ زکریا مسجد میں نہیں تھے، کھڑک کی مسجد میں تھے۔

حضرت شاہ عین الحق قدس سرہٗ کو شمس مارہرہ قدس سرہٗ نے تمام سلاسل قدیمہ وجدیدہ میں مجاز بیعت فرمایا ہے اور خزانہ دار بنایا ہے۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ ''سلسلۂ عالیہ قادریہ اور چشتیہ نظامیہ دونوں میں مجاز بیعت تھے''۔

''اس ترجمہ کی ضرورت'' میں جو آپ نے تحریر فرمایا ہے، درست ہوگا اب میں رضوی ترجمہ اور قادری ترجمہ دونوں کا تقابلی مطالعہ کروں گا۔ میرے پاس رضوی ترجمہ والا قرآن مجید ہے، میری بیوی مرحومہ اس کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ بچیوں کو بھی میں نے اسی ترجمے کے قرآن دیئے ہیں، مگر مجھے خود کبھی ترجمہ پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

حکیم مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے فرمایا تھا ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب　　　گرہ کشا ہے نہ راری نہ صاحب کشاف

خود ہی کوئی بات سمجھ میں آ جائے تو بڑی لذت حاصل ہوتی ہے۔ بہر حال انشاء اللہ اب دونوں کا مطالعہ کروں گا، **والامر بیدہ تعالیٰ**.

یہ خامہ فرسائی آپ کے دستخطی حصوں سے متعلق تھی، اب ذرا عرض ناشر پر بھی نگاہ ڈالوں کہ تنبورۂ ما چہ می سراید۔ شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ کو قرآن کے اردو ترجمہ میں اولیت حاصل ہے اور جب تک ان سے متقدم کسی کی کاوش نہ ملے اسے تسلیم کرنا پڑے گا۔ ''تعارف تفسیر عباسی کی خصوصیات'' کی ابتدا ''حامداً ومصلیاً وسلماً'' سے کی گئی ہے۔ پہلے دو صفت کے صیغے ہیں تیسرا مصدر؟ سب کو ایک سا ہونا چاہیے۔

حضرت استاذی مولانا مفتی حبیب الرحمٰن قادری علیہ الرحمہ جب سوال سن کر جواب مجھے املا کراتے تھے تو فرماتے تھے لکھو ''**مبسملا و حامداً و مصلیا و مسلما**''، یہ **مبسملا** اور **مسلماً** میں نے کسی اور کی تحریر میں نہیں دیکھا۔ غالباً یہ الفاظ آپ نے جناب ناشر کو لکھ کر دیے اور

ان سے پڑھے نہیں گئے۔ **مبسملا** تو ان کے گلے سے اترا ہی نہیں، **مسلما** کو **سلٰماً** کر دیا۔ نقل را ہم عقل باید۔

صرف ایک سطر میں تفسیر عباسی کا تعارف ختم ہو گیا۔ آگے تو سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعارف ہے اور تعارف کی تان ''آپ مہندی کا خضاب لگاتے تھے'' پر ٹوٹی ہے۔

عرض ناشر نہ سہی، تعارف تفسیر و صاحب تفسیر آپ کو خود لکھنا چاہیے تھا خواہ اس پر دستخط ناشر صاحب کے ہی ہوتے۔

ناشر نے آپ کے مختصر حالات لکھے ہیں۔ آپ سے پوچھ کر ہی لکھے ہوں گے میں ان میں گفتگو نہیں کر سکتا۔ ہاں اس پر تعجب ضرور ہے کہ اساتذہ کی فہرست میں سرکار صاحب اقتدار قدس سرہٗ اور حضرت اقدس قدس سرہ کا تذکرہ نہیں، ممکن ہے سرکار استغراق میں رہتے ہوں، اس کے باوجود تبرکاً ہی سہی کوئی کتاب ان سے شروع ضرور کی ہوگی ''**من علمنی حرفا**'' میں تو وہ آ ہی جاتے۔

مولانا مفتی حبیب الرحمٰن علیہ الرحمہ حضرت اقدس قدس سرہٗ سے کچھ ہی متقدم تھے مگر انھیں اپنا استاذ کہتے تھے مجھے بتایا کہ سرکار کسی گاؤں تشریف لے جا رہے تھے عرض کیا ''میرے درس کا کیا ہوگا''؟ فرمایا ''حبیب الرحمٰن سے پڑھ لینا''۔ صرف ایک درس کی بنا پر اُن کی استاذی کا اعتراف فرمایا۔

حضرت اقدس قدس سرہ نے سرکار کے حکم سے مسند درس آراستہ کی تھی، آپ سے پہلے کے طلبہ بھی ان کے شاگرد ہیں، خاص طور پر یونیورسٹی کے امتحان دینے والے تو سب ان کے شاگرد تھے، پھر آپ نے ان سے ایک حرف بھی نہ پڑھا، بات عجیب سی لگتی ہے۔

یہ پڑھ کر کہ آپ نے حدیث کی تکمیل مولانا ابراہیم علیہ الرحمہ سے کی ہے امید کی ایک کرن نظر آئی، انھوں نے آپ کو سند حدیث مسلسل ضرور دی ہوگی، مجھے اس کا عنعنہ چاہیے۔ میں نے سند حدیث مسلسل کے لیے حضرت اقدس قدس سرہٗ کو حدیث سنائی، انھوں نے سند مسلسل زبانی سنا دی، میں لکھ نہیں سکا، فرمایا ''ہم خود کسی وقت لکھ دیں گے''۔ ناسازی مزاج نے مہلت نہ دی، میں تحریری سند سے محروم رہ گیا حالانکہ حدیث سنانے اور سند سن لینے سے میرا سلسلہ تو مکمل ہے مگر

دوسرے کوسند دے نہیں سکتا۔ مولانا حبیب الرحمٰن مرحوم (الشہیر بہ مجاہد ملت) آئے، سند چاہی میں نے کہا مجھے حدیث سنائی نہیں میں سند کا ہے کی دوں؟ انھوں نے کہا ''بمبئی جا کر نرسنگ ہوم میں حضرت اقدس کو حدیث سنائی ہے اور سند سنی ہے، اب تم سند دے دو''، میں نے کہا یہی بد نصیبی میرے ساتھ ہے سند سنی لکھ نہ پایا۔

اگر آپ مولانا ابراہیم علیہ الرحمہ کی عطا کردہ سند کی نقل بھیج دیں تو میں سرکار قدس سرہ کے بعد حضرت اقدس قدس سرہ کا نام اور اپنا نام جوڑ لوں گا اور دوسروں کو سند سنا سکوں گا۔

''(بڑھے مولوی صاحب) مولانا احمد الدین صاحب علیہ الرحمہ کو متون یاد تھے''، وہ آپ جانتے ہوں گے، میرے ساتھ تو یہ لطیفہ ہوا ہے کہ میں شرح جامی پڑھتا تھا اور وہ سامنے نحو میر رکھتے اور فرماتے ''ملا صاحب نے کیا بات کہی میر صاحب لکھ گئے ہیں''۔ نحو میر کی تشریح ملا جامی کے مطابق کرتے۔

عمر ۹۹ سال ہوئی، ''احمد اغر'' تاریخی نام ہے۔ درگاہ قادری میں قبر پر کتبہ ہے، عمر ۹۹ سال تحریر ہے، ایک سو دس سال درست نہیں۔

آپ کی بیعت کا ذکر ''غالبًا'' سے کیوں شروع ہوتا ہے، اس میں شبہ کیا ہے، عرس قادری (جمادی الاولی ۱۳۳۳ھ) میں آپ اور ساتھی اور متقدم داخل سلسلہ ہوئے۔ غالبًا یہ سب سترہ تھے، ان میں حافظ لطافت علی صاحب اور آپ دونوں لاہور میں ہیں۔

اسی ذیل میں تاج الفحول محبّ رسول مولانا شاہ ''محمد عبدالمقتدر'' قدس سرہ العزیز لکھا گیا ہے ''عبدالقادر'' ہونا چاہیے۔

بیعت کے بعد اس کا تذکرہ بھی ضروری تھا کہ حضرت اقدس قدس سرہ نے آپ کو مجاز بیعت فرمایا ہے۔ **ذلک فضل اللّٰہ یعطیه من یشاء** ۔

عیب وے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

تلامذہ کی فہرست میں نمبر ایک اس نالائق کا نام ہے۔ یہ میرے لیے باعث صد افتخار ہے کہ اکابر تک سلسلۂ درس کی سند آپ نے دے دی۔ اگر چہ میں ان تہی دامان قسمت میں ہوں جن

کے لیے رہبر کامل سودمند نہ ہونے کا اشارہ ایک مرد کامل کر گیا ہے۔ میں اپنی نالائقی اورمحرومی تسلیم کرتا ہوں، اس کے باوجود فیوض اساتذہ کا قائل ہوں۔ جس روز صبح کالج میں پہلا درس دینا تھا شب میں مولانا حبیب الرحمٰن علیہ الرحمہ تشریف لائے، میں نے عرض کیا آپ کا تو انتقال ہو چکا، فرمایا میں اب بھی تمہیں پڑھاؤں گا۔ آنکھ کھلی تو قصیدہ بردہ کا یہ شعر زبان پر تھا

"ومن تکن برسول اللّٰہ نصرته......الخ"

حضرت اقدس کو خواب سنایا، فرمایا مولانا حبیب الرحمٰن شہیدوں میں شامل ہوئے، زندگی دوام شہید کو ہی ملتی ہے اور یہ شعر تمہیں عطا ہوا، ورد کرو۔

چھتیس (۳۶) سال فیوض کا مشاہدہ ہوتا رہا، جن کا نام نہ سنا تھا وہ کتابیں پڑھائیں۔

میرا نام "محمد" ہے صرف محمد، عبدالہادی تو لاحقہ ہے۔ اب تو بس ہادیٔ القادری رہ گیا ہوں۔ سرکار قادری کا مدح خواں شاعر جو ہوں۔

میں شعبۂ ادب عربی میں مدرس تھا، اسلامیات میں نہیں۔

آپ کے نمبر ایک شاگرد مفتی احمد یار خاں مرحوم تھے، میرا نام تو بہت بعد میں ہونا چاہیے، تب بھی باعث صد افتخار ہی ہوگا۔ آئندہ اشاعت میں تصحیح فرمادیں، سب پر سلامتی اور بس۔

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۸۱/۹/۲۵ء

پس نوشت: مثنی بخدمت سامی حضرت الشیخ زیب سجادۂ قادریہ مجیدیہ دامت برکاتہم مرسل ہے کہ کتب خانہ مدرسہ قادریہ میں ترجمہ قادری کے ساتھ محفوظ رہے۔

بنامِ ڈاکٹر اسعد بدایونی

ہوالمقتدر

زاویہ قادریہ

,341-6-5 نام پلی، حیدرآباد (اے پی)

عزیزی اسعدک اللہ و بارک لک سلامتی، رحمت اور برکات، بہت سی دعائیں ڈھیروں پیار

سب سے پہلے تو اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہوں کہ تم نے فکری صاحب سلمہ کو اپنا مجموعہ(ا) بھیجا اور میں نے انھیں پہنچانے سے پہلے کھول لیا اور بیک نشست سرسری نگاہ ڈال گیا۔ کتاب ہاتھ آئے اور اسے نہ پڑھوں یہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال اب تو غلطی ہو ہی گئی، تم بھی معذرت قبول کرلو تو آگے چلیں۔ کیوں تو آگے پڑھیں؟

بسم اللہ کتاب کھولی، مصنف کا مختصر تعارف نظر پڑا، خوشی ہوئی کہ صاحبزادہ میں صلاحیت باقی ہے۔ ابتدائی مشیر کی حیثیت سے ہی سہی پیام صاحب کا نام لکھا ہے، اگر ابتدائی مشورے کی قید نہ ہوتی تو زیادہ خوشی ہوتی، مجھے دیکھو بوڑھا ہو گیا ہوں مگر سرکار قادری میں کوئی نعت منقبت ایسی پیش نہیں کرتا جس میں استاذ علیہ الرحمہ اور دوسرے پیشرو مداحوں کا تذکرہ نہ ہو، حالانکہ استاذ علیہ الرحمہ نے سوائے منہ چومنے اور شاد باشی دینے کے اور کچھ نہیں کیا۔ میں نے استاذ بناتے وقت یہ شرط رکھی تھی میرے شعر میں اصلاح سازی نہیں ہوگی، انھوں نے وعدہ کرلیا تھا مگر شاگردی میں قبول کرنے کی جو شرط رکھی تھی وہ خود ایسی کڑی تھی کہ اس کی طرف خیال رکھوں تو پھر استاذ کا کام خود بخود ہو جاتا ہے اور اب صرف شاد باشی دینا اور منہ چومنا ہی اس کی ذمہ داری رہتی ہے۔

بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ استاذ نہ سہی مشیر اور صرف ابتدائی مشیر سہی مگر تم اس کا نام لکھنے سے ہچکچاتے نہیں۔ اللہ برکت دے۔

شعر خواہ اپنے جذبات کی تسکین کے لیے ہی کہا جائے، لفظ اور زبان کے اسقام سے تو اسے

ا۔ ڈاکٹر اسعد بدایونی کا مجموعہ کلام ''دھوپ کی سرحد'' خالد بدایونی کی ترتیب سے ۱۹۷۷ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا۔ ہم جناب وارث رفیع بدایونی کے شکر گزار ہیں جنھوں نے یہ مجموعہ فراہم کیا، اسی کی مدد سے ہم نے حاشیہ میں وہ اشعار درج کر دیے ہیں جن کی طرف مکتوب میں اشارہ کیا گیا ہے۔

پاک ہونا ہی چاہیے اور اگر اسے کسی دوسرے کو سنانا بھی ہے تب اس میں ابلاغ اور ترسیل کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔

علامتوں کا استعمال کوئی جدت نہیں ہے۔ مرزا نوشہ نے بھی کہا ہے ۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مگر مرزا نوشہ اور ان سے آگے پیچھے رہنے والوں کو منجھی منجھائی علامتیں ملی تھیں، جن کا سمجھنا کسی کے لیے مشکل نہ تھا۔ ممکن ہے ایک صدی بعد آج پیدا کی جانے والی علامتیں بھی سمجھی جانے لگیں۔ مگر فی الحال جب تک خود شاعر نہ بتائے کہ اس نے مچھر بہادری کی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے کوئی سمجھ نہ پائے گا کیونکہ ہر شخص کو تو یاد نہ ہوگا ۔

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی　　　جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

خیر یہ مبحث بہت طولانی ہے اور مجھے تمہاری جولانی طبع پر کوئی روک بھی نہیں لگانا ہے جو دیکھو، سمجھو وہ کہو اور خوب سے خوب تر کی طرف گامزن رہو۔ میں سمجھ پاؤں یا نہ سمجھوں اس سے غرض نہیں۔

طبع موزوں ہے، علم اور مشق خود راہبری کریں گے۔

اچھا تو اب میں یہ ثبوت پیش کردوں کہ میں نے سرسری ہی سہی مگر نگاہ ڈالی ہے۔ ''ص'' صفحہ کی اور ''س'' سطر کی نشاندہی کریں گے پھر ایک بار یہ بتادوں کہ یہ صرف تمہارے مطالعہ کے لیے لکھ رہا ہوں۔ خود دیکھو اور غور کرو، کسی سے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

ص۸/س۳۔ ''تلک'' (۱) سے قطع نظر کہ متروکات میں ہے ''وصالوں'' ہرگز صحیح نہیں۔ وصل دس ہزار بار بھی ہو تو وصل ہی کہلائے گا۔ س۵ ''اس سے ہوئیں'' (۲)، ''اس'' اسم اشارہ اور ضمیر دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اشارہ ہو تو مشارٌ الیہ ہونا چاہیے، ضمیر ہو تو مرجع ہونا چاہیے، یہ شاید کوئی تیسری قسم ہے۔

ص۹/س۶۔ ''سنو'' (۳) یا تو حشو محض ہے یا دیکھو کے معنی میں استعمال کیا ہے، دن کے ساگر میں موج دیکھی جاسکتی ہے سنی نہیں جاسکتی۔

ص۱۲/س۱۱۔ ''ہوائے وقت'' (۴) ہوا بمعنی خواہش فارسی لفظ ہے، فارسی ترکیب سے استعمال ہوتا ہے مگر ''ہوا'' بمعنی باد اُردو ہے اسے فارسی ترکیب سے استعمال کرنا غلط ہے، وقت کی ہوا کہہ

سکتے ہیں۔س۱۴ ''ہاتھ'' (۵) کے لیے کتر نا ادب میں اضافہ ہے اور پھر فعل لازم تو اور بھی کمال ہے۔

س۱۵ ''روائتیں'' املا کی غلطی ہے، روایت سے روایتیں ہونا چاہیے، بدواں لہجے کا اثر ہے۔

ص۱۴/س۷ ''اس'' کا نہ مشارٌ الیہ ہے نہ مرجع۔ ''گلاب'' نزاکت و لطافت کی علامت ہے، (۶) جمع سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہاں اگر ''گلابوں'' میں ''ں'' نہ لکھا ہوتا تو ایک بات بھی تھی، ''گلابو'' کسی نازک لڑکی کا نام ہوسکتا تھا۔

ص۱۵/س۷-خزینہ اور ذخیرہ میں فرق ہے (۷)، ذخیرہ کسی چیز کے ڈھیر کو کہتے ہیں، خزینہ کسی جگہ رکھی ہوئی چیز کو۔ نفرت دل یا دلوں میں رہ سکتی ہے دلوں کا ڈھیر نہیں لگا سکتی۔

ص۱۶/س۱۱- میرا من کی باغ و بہار پڑھو ''بدن'' جسم کے مخصوص حصہ کو کہتے ہیں (۸)

ص۱۸/س۳- لفظ دکان ہے (۹) بغیر واو۔س۵،۶ عجیب بات ہے ردی کو الماری میں جمع کرنے کا شوق بہت ہی نادر ہوسکتا ہے (۱۰)، ویسے ردّی دال پر تشدید کے ساتھ بھی غلط ہے۔

ص۱۹/س۳-قلم کی لغزش کے سوا کچھ نہیں مگر سفیر کا رنگ سپید پڑ گیا (۱۱)۔

ص۲۱/س۹،۱۰- ریگذار اور لالہ زار میں سے کوئی ایک ہی صحیح ہوگا (۱۲) دوسرے کو بھی ویسا ہی کر لو ذ سے یا ز سے۔

ص ۲۵/س۸- مثال اور مثل دونوں بالکل علیحدہ ہیں ''ضرب'' کے معنی بیان کرنا ہیں جو مثل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے (۱۳)۔س۱۱ ''ہوا'' پھر فارسی ترکیب کے ساتھ (۱۴)۔

ص۲۷/س۶ -آواز دینا محاورہ ہے لگانا نہیں (۱۵)۔

ص ۲۸/س۳- واقعاتی غلطی ہے، جب سورج سر پر ہوتا ہے زرد نہیں ہوتا، طلوع و غروب کے وقت زرد ہوتا ہے (۱۶)۔

ص۳۴/س۴-''طرح'' دو طرح مستعمل ہے اور دونوں طرح جائز ہے، ''رح'' دونوں ساکن یا ''ر'' متحرک اور ''ح'' ساکن، مگر تم نے ''ر'' ساکن اور ''ح'' متحرک باندھی ہے (۱۷)، یہ درست

نہیں۔س ۶ ''صبح'' کی ''ح'' بھی ساکن ہے اس کو بھی متحرک باندھا ہے(۱۸)۔

ص۳۸/س ۷۔''سہم سہم'' کی ''ہ'' بھی متحرک باندھی ہے(۱۹)۔

ص۳۹/س۱۱۔''دوپہر'' باعلان ''و'' ہوتو ''پہر'' کی ''ہ'' متحرک ہونی چاہیے ورنہ ''و'' کا اعلان درست نہیں (۲۰)۔س۱۲، پھر وہی ''بدن''، بابا یہ گالی ہے۔

ص۵۰/س۳۔''چٹان'' ''ٹ'' مشدد کے ساتھ باندھا ہے(۲۱)، حالانکہ اس سے پہلے یہ لفظ ''ٹ'' خفیف کے ساتھ تم نے خود باندھا ہے۔ایک ہی صحیح ہوگا۔

ص۵۲/س۱۰۔''اس'' کا نہ مشارالیہ ہے نہ مرجع (۲۲)،کوئی سمجھے تو کیا سمجھے۔

ص۵۳/س۹۔بخیل،اسم صفت ہے۔اس سے پھر صفت نسبتی بنانا درست نہیں۔''بخیلی'' سے شاید تم بخل کہنا چاہتے ہو(۲۳)۔

ص۶۰/س۱۰،۱۲۔صوتی قوافی کا چلن ہوتو رہا ہے،مگر ہے غلط (۲۴)۔

ص۶۱/س۱۰۔واردات خود ہی جمع مونث سالم ہے،اس میں ''وں'' کا اضافہ درست نہیں (۲۵)۔

ص۶۵/س۲۔ پھر وہی وصال بصیغۂ جمع اور لطف یہ کہ بہت سے وصال کے بعد بھی مزا تھوڑا ہی چکھنے کو ملے(۲۶)۔س۴ جب حادثہ کو دن بیت چکے تب تو صف ماتم اٹھانے کا وقت آیا نہ کہ بچھانے کا(۲۷)۔

ص۶۶/س۱۲۔''مضافات''،جمع ومونث سالم ہے،''ون'' سے پھر جمع بنانا درست نہیں (۲۸)۔

ص۶۹/س۱۲۔''صحراؤں'' بصیغۂ جمع ہے تو اذاں بھی بصیغۂ جمع ہونا چاہیے تا کہ فی صحرا ایک اذاں کا حساب تو پڑ جائے، دوسرے یہاں ''اذاں'' صرف صدا کے معنیٰ میں ہے(۲۹)، حالانکہ لفظ منقول پھر اصلی معنیٰ میں استعمال نہیں ہوتا۔

ص۸۷/س ۷۔''کوئی'' حرف تنکیر ہے (۳۰)،''تو کوئی پارہ'' تو کہا جا سکتا ہے۔''سی پارہ'' تو پورا قران ہوا، جسے تیس اجزا میں تقسیم کر لیا ہے،سی کا معنیٰ تیس ہے،اسی لیے سی پارہ کہتے ہیں یعنی تیس حصے۔

اب تو ماننا ہی پڑے گا کہ سرسری ہی سہی مگر میں نے نگاہ ضرور ڈالی ہے،نشان لگا تا گیا تھا، بعد میں ورق گردانی کا ماحصل تمہیں لکھ دیا،ممکن ہے بعض فنی الفاظ ابھی تمہاری سمجھ میں نہ آئیں، مگر

مطالعہ کرتے رہو، استاذ سے کسب فیض کرتے رہو، سب جان جاؤ گے۔

ان تمام آڑی ٹیڑھی لکیروں کے باوجود ایک شعر ایسا بھی نگاہ سے گزرا کہ میں نے اس پر ''✓'' نشان لگایا، وہی ایک شعر تم سے امید وابستہ کرنے کے لیے کافی ہے، ناتمامی کا احساس ہے تو وہی تکمیل کی ضمانت بنے گا، اس وقت تم سامنے ہوتے تو ضرور منہ چوم لیتا۔

نہ اپنے گھر کا پتہ ہے نہ منزلوں کا سراغ   مری طرح کوئی دنیا میں بے نشاں بھی نہ ہو

زندگی ہے تو انشاءاللہ عرس قادری میں حاضری کی سعادت حاصل کروں گا۔

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۴/۸/۷۸م

(حواشی)

۱۔ کب تلک جیتے وصالوں کی تمناؤں میں لوگ ☆ زندگی سے ایک دن بیزار ہونا تھے، ہوئے

۲۔ اور تھے وہ جن کو جاگیریں عطا اُس سے ہوئیں ☆ اپنی قسمت میں تو بس فنکار ہونا تھا، ہوئے

۳۔ پھر شام لے کے آنے لگی درد کے چراغ ☆ پھر دن کے ساگروں میں سنو موج شب چلی

۴۔ ہم کو ہوائے وقت نے دی ہے شکست بارہا ☆ سیپ کی طرح بند تھے گل کی طرح بکھر گئے

۵۔ شعر کہوں تو کس طرح، نظم کہوں تو کیوں بھلا ☆ میری زبان چھن گئی، ہاتھ مرے کتر گئے

۶۔ میں اب بھی اس کو گلابوں کی طرح جانتا ہوں ☆ کہے ہزار زمانہ اسے کہ پتھر تھا

۷۔ سوچو تو نفرتوں کا ذخیرہ ہر ایک دل ☆ کرتے ہیں یوں تو پیار کا اظہار سب کے سب

۸۔ ہے لوچ ترے نرم بدن کا سا دھنک میں ☆ موسم نے ترا رنگ چرایا بھی بہت ہے

۹۔ شہر کی دوکانیں خالی ہوگئیں ☆ اس قدر سودا خریدا ایک دن

۱۰۔ جان کر مجھ کو کوئی رڈی کتاب ☆ اس نے الماری میں پھینکا ایک دن

۱۱۔ سفیر دن کے روانہ زمیں سے ہوتے ہیں ☆ سیاہ رات کا پیکر ہوا میں اڑتا ہے

(پہلے مصرع میں کاتب نے ''سفیر'' کو ''سفید'' لکھ دیا تھا۔

۱۲۔ چہروں کے ریگزار سنوارے گئے بہت ☆ زخموں کا لالہ زار نکھرنے سے رہ گیا

۱۳۔ میرا وجود شہر میں ضرب المثال تھا ☆ میں کیسے مسئلوں کے جزیرے تک آ گیا

۱۴۔ وہ جو ہوائے تیز سے دردوں میں بٹ گیا ☆ اس کا وجود شہر میں کیوں لازوال تھا

۱۵۔ مَیں لوٹنے جو لگا دشت سے نگر کی طرف ☆ لگا رہے تھے مجھے سب درخت آوازیں

۱۶۔ زرد سورج سروں کے اوپر تھا ☆ لوگ سائے کے نام سے چونکے

۱۷۔ سیکڑوں بادل برس کر راہ اپنی الگ گئے ☆ لیکن اس صحرا کی طرح کوئی پیاسا نہ تھا

۱۸۔ ڈھونڈ کر سورج کا ٹکڑا ایک لے آئے تھے لوگ ☆ برف جسموں کا مگر صبح تلک پگھلا نہ تھا

۱۹۔ سبھی درختوں سے پنچھی سہم سہم کے اڑے ☆ وہ اک سکوت جو ٹوٹا مری نجات کے بعد

۲۰۔ مرے عہد کی گرم دوپہر میں ☆ بدن سنتروں کے نچوڑے گئے

۲۱۔ جو لوگ زندگی میں تھے چٹان کی طرح ☆ ٹوٹے تو شاہ راہ کے پتھر بنے گئی

۲۲۔ تمام شہر خلاؤں میں جانے والا ہے ☆ اس ایک شخص کو یہ راز کیوں بتایا گیا

۲۳۔ گاؤں بھر میں جو بخیلی کے لیے تھا مشہور ☆ شہر میں اس کی عنایات کا شہرہ پاتے

۲۴۔ گم شدہ موسم کی یادیں دل میں رکھنا ہے فضول ☆ بھاگتے لمحوں کی تتلی ہات آتی ہی نہیں

۲۵۔ چھاؤں میں ان کی حادثے ہوتے ہیں روز و شب ☆ کتنی ہی وارداتوں کے ہیں راز داں درخت

۲۶۔ کشادہ راہ سے میری گلی کا منھ لگا بھی دو ☆ وصالوں کا مزہ تھوڑا سہی اس کو چکھا بھی دو

۲۷۔ ہماری آنکھ کے آنسو نہ پی جائے کہیں سورج ☆ بہت دن ہو چکے ہیں اب صف ماتم بچھا بھی دو

۲۸۔ بس گئے شہر حقیقت میں وہ جن کے دل نہیں ☆ اہل دل تو اب بھی خوابوں کے مضافاتوں میں ہیں

۲۹۔ کر ایسی شے کی طلب جس کو پا سکے اسعدؔ ☆ دعا وہ مانگ جو صحراؤں کی اذاں بھی نہ ہو

۳۰۔ ہوا اڑا کے نہ لے جائے کوئی سی پارہ ☆ ورق ورق مرے خوابوں کی داستاں رکھنا

☆☆☆

بنام ہمشیرہ (بیگم خواجہ احتشام الدین قادری)

ہوالمقتدر

غزال! سلامتی، رحمت اور برکات

اس عرصہ میں کافی شعر کہتا رہا، کچھ فارسی عربی اشعار تو محترمہ حنظل صاحبہ کی خدمت میں پیش کیے ہیں۔

اسے اتفاق ہی کہو کہ برسوں میں ایک غزل بھی ہوگئی، ان دس برسوں میں یہ دوسری غلطی ہے۔ ہوا یوں تھا کہ ایک جگہ رباعی کا طرحی مشاعرہ تھا، رباعیاں نعت میں کہنی تھیں۔ حکیم محمود الرحمٰن صاحب کی صدارت تھی، ان کے خاندان سے مدرسہ قادریہ کے اکابر کے بڑے خاص تعلقات تھے، میں ان کا احترام کرتا ہوں، وہ بھی بے حد کرم کرتے ہیں۔ اتفاق سے اورنگ آباد سے یعقوب بھائی آئے ہوئے تھے، ان کے ساتھ حکیم صاحب کے پاس گیا انھوں نے فرمایا ''کل مشاعرے میں آ رہے ہو؟ اچھا تم اور یعقوب دونوں میرے پاس آ جاؤ اور میرے ساتھ چلو''۔ مجبوراً رات میں رباعیاں کہنی پڑیں اور ان کے ساتھ مشاعرے میں شرکت کی۔

جب میں پڑھ کر تخت سے اترا تو یعقوب بھائی نے یہ داد دی، ''اوا استاذ! اب تو بوڑھا ہو گیا، پینترے بازی پر اتر آیا اچھا ہوا غزل چھوڑ دی، اب استاذی دکھایا کر''۔

دوسرے روز غزل کہہ ڈالی اور یعقوب بھائی کو سنا دی، خوش ہوئے۔

ہاں تو وہ غزل تمھیں سنا دوں تو کیا مضائقہ ہے تم باجی جان کو سنا دینا، ممکن ہے کہیں اصلاح کی ضرورت ہو۔

دل میں ہر جلوۂ صد رنگ سمو لو دیکھو — میری دنیا میں مگر آنکھ نہ کھولو دیکھو

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

۱۴/۷/۱۹۷۰ء

ھوالمقتدر

عزیز غزالہ واحتشام بارک اللہ لکم   سلامتی، رحمت اور برکات

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ زندہ ہوں اور کیا چاہیے۔

ہائے اردو مرحوم۔ تم جو نہیں چاہتی ہو وہ لکھتی ہو مگر اردو اب ہے کہاں؟ میری بھابی اماں نے دودھ کے ساتھ گھٹی میں پلائی تھی۔ اردو میں ''خبر'' اور ''اطلاع'' دونوں کے معنیٰ میں فرق ہے، تم میری خبر چاہتی ہو تو وہ وقت آنے کے بعد دوسرے دیں گے، اطلاع چاہو تو معلوم کر وابھی زندہ ہوں اور نہ جانے یہ سلسلہ کتنا لمبا ہو۔ لیٹا ہوا ہوں، سر اٹھاتے ہی چکر آتے ہیں۔

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۹۸۹/۶/۱۰ء

بنام حافظ سید عبد المولیٰ قادری بریلوی

ہوالمقتدر

۳رشوال ۱۳۴۹ھ — مدرسہ قادریہ بدایوں

مولا بخش صاحب! تسلیم نیاز

بے نیازی تری عادت ہی سہی — ہم ہی تسلیم کی خو ڈالیں گے

در دولت پر حاضری دی مگر بے کار، وہاں بھی نگہ ناکامیاب، معلوم ہوا کہ ''صاحب واک کرنے کے لیے اسٹیشن گیا ہوا ہے''۔ سخت غصہ آیا اور صرف لفظ چغد پر اکتفا کیا۔

چھتیس گھنٹہ ہو چکے ہیں کہ جناب کی زیارت سے مشرف نہیں ہوا۔

فرض کردم کہ بیاد تو دلم خر سند است

لیکن ایں دیدۂ دیدار طلب راچہ علاج

آخر اس وقت تک مدرسہ تشریف آوری کیوں نہیں ہوئی، جلد آؤ سخت انتظار ہے، فوراً تشریف لائیے بعید از عنایات نہ ہوگا۔ کیا میں آپ کا انتظار کروں؟

والسلام

محمد عبد الہادی القادری

مدرسہ قادریہ بدایوں

ہوالمقتدر

محمد عبد الہادی القادری بدایونی

متعلم فاضل

مدرسہ محمدیہ امدادیہ، بہادر گنج الہٰ آباد

ڈیر مولا بخش! السلام علیکم

تم سے رخصت ہو کر بخیریت الہٰ آباد پہنچا، آتے ہی ارادہ تھا کہ تم کو خط لکھوں اور تمہاری

مطلوبہ چیز تم کو بھیج دوں مگر طبیعت کچھ اس قدر کسلمند رہی کہ مکان بھی خط نہ لکھ سکا۔ امید ہے کہ کچھ خیال نہ کروگے کیونکہ اس دیر حاضری خط میں کچھ نقصان بھی نہیں ہوا۔ یہ خط تم کو نوچندی جمعرات سے پہلے مل جائے گا اور تم وظیفہ پڑھ سکو گے۔

مولا بخش ہمارے لیے بھی دعا کرنا اور اس معاملہ خاص میں دعا ضرور کرنا جس کا ذکر تم سے کر چکا ہوں۔ اگر خدا کو منظور ہے تو اس کے بعد بہت سی باتیں ہوں گی۔

میں وہ عمل تم کو تحریر کرتا ہوں جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، تم کو اس کے پڑھنے کی اجازت ہے دوسروں کو بھی بتا سکتے ہو اور اجازت بھی دے سکتے ہو۔

حافظ صاحب سے سلام عرض کر دینا، نور سے بھی سلام کہہ دینا۔

اور اپنی زوجہ محترمہ سے بھی سلام کہہ دینا بچی کو دعا، خدا کرے کہ تھوڑے دنوں بعد بچے کو بھی دعا لکھی جا سکے آمین۔

اور کوئی خاص بات قابل تحریر نہیں، خیریت سے مطلع کرنا

والسلام تمہارا مخلص بھائی

عبدالہادی القادری بدایونی

بنام مولانا سید معین الدین قادری جیلانی سلطان پور

ہوالمقتدر

معین بھائی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً تمہیں میرے خط کا انتظار ہوگا اور مجھے درگاہ قادری میں تمہارے خط سے زیادہ تمہارا انتظار رہا، مگر معلوم نہیں تمہارے یہاں کی چھٹی اور تعطیل سے استفادہ اور الحاق کے کیا اصول ہیں؟ اس لیے تم نہ پہنچ سکے تو اس کی وجہ ہی رہی ہوگی۔

میں ۵/شوال پنجشنبہ کو بعد مغرب بدایوں پہنچا، درگاہ قادری میں پہلی حاضری ۶/کو بعد فجر مدرسہ قادریہ کے معمولات کے مطابق ہوئی، جمعہ کو صبح سب درگاہ میں حاضر ہوکر قرآن کا ختم کیا کرتے ہیں۔

ابھی عرس قادری شروع ہونے میں دو دن ہیں، ان دنوں میں کچھ خانہ پری کرنی ہے پردیسی سال بھر بعد آتا بھی ہے تو زائر کی حیثیت سے، اب جو دو دن پہلے پہنچا ہے تو تعزیتیں کرلیں۔

موسم خوب سرد بلکہ یخ ہے، جی ڈر رہا ہے کہ درگاہ قادری میں چار راتیں پانچ دن کیسے گذریں گے مگر کچھ تو آسائش کے انتظامات کی فراوانی اور کچھ تصرفات روحانی کچھ بھی تو محسوس نہ ہوا۔

تفصیلی کیفیات عرس قادری لکھنی شروع کردوں تو تمہیں کافی انتظار کھینچنا پڑے گا جبکہ اب بھی تم یہی سمجھ رہے ہو کہ انتظار بہت طویل ہوگیا اور ممکن ہے خط لکھ رہے ہو۔

مناقب جس ترتیب سے پیش کیے ہیں اسی ترتیب سے بھیجتا ہوں، کیف لو اور حسب معمول اپنے تاثرات لکھ بھیجو۔

ابھی ایک جملہ معترضہ یاد آ گیا پھر بھول جاؤں گا اس لیے کیف میں غرق ہونے سے پہلے ہی وہ سن لو۔

اس سال عرس قادری میں اڑیسہ کے جناب مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے بھی شرکت کی جنھیں ان کی جماعت مجاہد ملت کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ بڑی دلچسپ ملاقاتیں رہیں۔ حضرت شیخ دامت برکاتہم نے ان کی پذیرائی اپنی مہمان نوازی کی شان سے کی۔

میرا تاثر بھی ان کے بارے میں بہت اچھا رہا، اس جماعت میں یہ کیسے فٹ ہیں تعجب ہے۔

آدمی سوز وگداز کے اور مرنجاں مرنج محسوس ہوئے۔

پھر بھی میں نے اپنے رنگ سے ان سے گفتگو کر ہی ڈالی۔ اختلافی مسئلہ کا ذکر آیا تو حضرت شیخ دامت برکاتہم نے فرمایا میں نے کوئی لڑائی شروع نہیں کی اور نہ بات بڑھانا چاہتا ہوں۔

میں نے مجاہد ملت سے عرض کیا ''مولانا کیا کروں حضرت شیخ کے احکام نے قید کر رکھا ہے ورنہ یہ (جیب سے قلم نکال کر دکھاتے ہوئے) دیکھ رہے ہیں، کیا ہے؟ دیکھئے یہ قلم ہے اور یقین جانئے اس کی سیاہی خشک نہیں ہوئی ہے۔ ایک بات اور واضح کر دوں میں ہر قسم کی تحریر پر قدرت رکھتا ہوں۔ اگر علمی باتیں یہ حضرات نہیں سمجھ سکتے تو گالیاں بھی میں ان سے زیادہ اچھی لکھ سکتا ہوں، آخر ادب کا طالب علم جو ٹھہرا۔

حضرت شیخ دامت برکاتہم نے فضا بدل دی اور فرمائش کی کہ ''بھائی جان مولانا کو اپنا عربی قصیدہ سنایئے''۔ میں نے کہا مولانا حضرت شیخ دامت برکاتہم بغداد پاک تشریف لے گئے تو بمبئی سے تحریر فرمایا ''بغداد میں تمہارا خط ملنا چاہیے'' گویا نذر طلب فرمائی فوراً ایک سہ آتشہ نذر کیا، اچھا سنیے فارسی، عربی اور اردو کا یہ سہ آتشہ''۔

غرض کہ کافی تفریح رہی، آخر میں رخصت ہوتے ہوئے وہ اپنا پتہ نوٹ کرا گئے کہ میں سہ آتشہ اور ابھی درگاہ قادری میں جو عربی قصیدہ پیش کیا ہے اس کی نقل بھی انھیں بھیج دوں اور سند حدیث کی نقل بھی مانگی اور بتایا کہ ''میں نے (مجاہد ملت نے) حضرت اقدس (عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر بدایونی) سے ان کی حدیث کی سند بطور خاص حاصل کی ہے کیونکہ وہ کسی دوسری جگہ نہیں، اس کی نقل چاہیے''۔ اشعار بھیج دیے، سند تلاش کروں گا۔

الحمدللہ معمولات پورے ہوئے۔ زندگی رہے تو اگلے سال پھر یہی کیف و مستی ہوگی، انشاءاللہ۔

گدائے خاک نشیں

ہادی القادری

مدرسہ قادریہ بدایوں

بنام اسید الحق محمد عاصم قادری

برادر عزیز شیخ عاصم القادری حفظکم اللہ و بارک لکم ...... سلامتی، رحمت اور برکات

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ امید کہ تم اور سب خیریت سے ہو گے۔ یہ گدائے خاک نشیں محمد قادری ایک کام میں لگا ہے دعا کی جائے جلد سے جلد مکمل ہو، آمین

اس سلسلہ میں آپ کی اجازت کی ضرورت ہے کہ میں جو کتاب شائع کروں اس کا ملنے کا پتہ ''شیخ عاصم قادری، مدرسہ قادریہ مولوی ٹولہ، بدایوں'' بھی لکھوں۔

کتاب کا نام ''احوال و مقامات'' ہوگا۔

قلم کار- محمد قادری گدائے خاک نشیں، طالب علم مدرسہ قادریہ سامنے کے صفحہ پر ہی لکھا ہوگا۔

کبھی کبھی خیریت لکھ دیا کرو۔ سب پر سلامتی اور بس، والسلام

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۳/۷/۹۱م

☆

برادر عزیز شیخ عاصم القادری بارک اللہ لکم زید مجدکم سلامتی رحمت اور برکات

ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔ امید کہ تم اور سب بخیر ہوں گے۔ میری طبیعت خراب تھی، پونے سے حضرت شیخ نے مجھے حیدر آباد بھیج دیا تھا۔ اب ٹھیک ہوں اور دولت آباد جانے کے لیے ریزرویشن کرالیا ہے، اپنے بڑے پیر کے دروازہ میں لوٹ لگاؤں تو مستی چھا جاتی ہے۔

مسجد خُرما میں قرآن تو تم نے ہی سنایا ہوگا؟ یہ تو تمہارا ہی حق ہے، اللہ برکات دے، آمین۔

سنا ہے تم نے عربی درسیات شروع کردی ہے، اللہ تمہیں ہر طرح اپنے اسلاف کا جانشین بنائے۔

احوال و مقامات کی کسی نے رسید بھی نہیں دی، خط تو لکھنا ہی چاہیے تھا، میں جو لکھ سکتا تھا وہ میں نے لکھا جسے پسند نہ آئے وہ خود ہی قلم چلائے اور مجھے مطلع کرے۔

سب پر سلامتی اور بس

گدائے خاک نشیں

محمد قادری

۱۷/۳/۱۹۹۲ء

فغان ہادی



تشطير الخمرية

''سقانی الحب کاسات الوصالِ'' ... حمدت اللہ ربی ذاالجلال

لقد اعطانی من شربٍ حلالِ ... ''فقلت لخمرتی نحوی تعالی''

''سعت و مشت لنحوی فی کوؤس'' ... لنعم الخمرا حلی من زلالِ

باسم الواھب المنعم شربت ... ''فھمت لسکرتی بین الموالی''

''فقلت لسائر الاقطاب لموا'' ... اذا انتم رجوتم بالکمالِ

فمیلوا بالقلوب الیَّ جمعًا ... ''بحالی وادخلوا انتم رجالی''

''وھموا واشربوا انتم جنودی'' ... سعید الذی یعمل فعالی

خذوا کاسی وکاسا بعد کاس ... ''فساقی القوم بالوافی ملالی''

''شربتم فضلتی من بعد سکری'' ... تلالئت الجباہ من الجمالِ

سماءَ الفضل من فضلی صعدتم ... ''ولا نلتم علوی واتصالی''

''مقامکم العلی جمعا ولکن'' ... علوی ذروۃ القصر الکمالی

علی الارض جبال فالسماء ... ''مقامی فوقکم مازال عالی''

''انا فی حضرۃ التقریب وحدی'' ... وقربنی حبیبی بالوصالِ

انا من کل نفسی طوع امرہ ... ''یصرفنی وحسبی ذوالجلالِ''

''انا البازی اشھب کل شیخ'' ... اذا ما اغتدی اعلی الجبالِ

لکل مفخر فی الخلق لکن ... ''ومن ذا فی الرجال اعطی مثالی''

''کسانی خلعۃ بطراز عزم'' ... بدیع الخلق ربی ذوالجلال

فدت نفسی علی لطف حبیبی ... ''وتوجنی بتیجان الکمالی''

☆ عربی شاعری میں ایک صنفِ سخن ''تشطیر'' کہلاتی ہے، جس میں شاعر کسی دوسرے شاعر کے قصیدے کے ہر مصرع پر مصرع لگاتا ہے، مندرجہ بالا قصیدہ حضرت غوث پاک کے مشہور قصیدے ''قصیدہ خمریہ'' کی تشطیر ہے (اسیدالحق)

"واطلعنى على سر قديم"   از ال السترعن وجه الجمالى
فاكرمنى بانعام جزيل   "وقلدنى واعطانى سوالى"
"وولانى على الاقطاب جمعا"   اد ير فى الجنوب وفى الشمال
عطانى سلطة فوق الجميع   "فحكمى نافذ فى كل حالى"
"فلوالقيت سرى فى بحار"   بامواج تموج كالجبال
هدى الطغيان من تاثير امرى   "لصار الكل غوراً فى الزوالِ"
"ولو القيت سرى فى جبال"   كبار شامخات والعوالى
الم يصعب عليها حمل سرى   "لدكت واختفت بين الرمالِ"
"ولو القيت سرى فوق نار"   واظهرت بنور قد بدالى
وعشقٍ قد ورثت من خليل   "لخمدت وانطفت من سر حالى"
"ولو القيت سرى فوق ميت"   رميم فى تراب القبر بالِ
فلبانى ندائى طوع امرى   "لقام بقدرة المولٰى تعالى"
"وما منها شهور اودهور"   من ايام منيره ام ليالى
وليست ساعة جائت بشىء   "تمرو تنقضى الا اتالى"
"وتخبرنى بما ياتى و تجرى"   به الايام حالا بعد حالِ
انا السلطان ايام عبيدى   "تعلمتى فا قصر عن جدالى"
"مريدى هم وطب واشطح وغن"   وجرع خمر كاسات الوصال
اتاك الهم فانزل فى حماى   "وافعل ما تشا فالاسم عالى"
"مريدى لا تخف اللّٰه ربى"   جواد ذوالعطاء والنوال
حبيبى اسبغ النعمة علىّ   "عطانى رفعة نلت المنالى"
"مريدى لا تخف واش فانى"   الب مستمدا فى النزالِ
لتشهد اننى عذب رقيق   "عزوم قاتل عند القتالِ"

"طبولی فی السماء والارض دقت" لـقهـری بیـنهـن والـجلال
بهٰـذا أنـعـم الـلّٰـه عـلـیّ "وشاوؤس السعادة قد بدالی"
"بلاد اللّٰه ملکی تحت حکمی" کـمـا شـئـت ادیـر لا ابـالـی
فـلـحـت حین زکـانی الٰهی "ووقتـی قبـل قـلبـی قد صفالی"
"نـظـرت الـی بـلاد اللّٰـه جمعا" جعـلت حینما فی الملک والی
فعـاینـت صغیـرا او کبیـرا "کـخـردلة عـلی حکم اتصالی"
"وکـل ولـی لـه قـدم و انی" ورثـت مـن حبیـب اللّٰـه حـالـی
اطیـع امـر ربـی قـد اسیـر "عـلـی قـدم الـنبی بدر الکمالِ"
"درست العلم حتی صرت قطبا" بـجهـد تـرتـقـی درج الکمـالِ
ولا تسـعـد بـدون الشیـخ فانظر "ونلت السعد من مولی الموالی"
"رجـالـی فـی هـو اجرهم صیام" و یـقتـاتـون مـن عـذب زلالِ
یضـیء قـلبهـم مـن نور ربـی "وفـی ظـلم اللیالی کاللآلی"
"انـا الحسنی والمخدع مقامی" ولیـس فیـکـم درّاک حـالـی
حبیبـی خـصّـنـی فـوق الجمیع "واقـدامـی عـلـی عنق الرجال"
"انـا الـجیلی محی الدین اسمی" سـفیـت الـدیـن مـن داء عضـالِ
لـقـد سـرا لبـلاد بـالسـلامـه "واعـلامـی عـلـی راس الجبال"
"وعبـد الـقادر المشهور اسمی" بـامـر مـن قـدیـر ذی الـجـلالِ

فسـل یـا عبـدی الهاذٓیَ لتعطی
"وجـدی صـاحـب العین الکمـالِ"



علیٰ نهج عمرو

ا اُمــی لا تــظــنــی ان ادیــن بسـلـطــان الـعـداء الـظـالمین

ولــدت ثــم فــی اذنـیّ عـمـی لا لـقـی بــاسـم رب الـعـالمین

وما فارقنا حضنک فی الرضاعه بشدی من سواک لما رضینا

لک الشکرا لجزیل علی حنینک فمنـذ البـدء لسنـا مشرکینـا

حـرمتک فـجأة بعد الفطام فـخـلـذی ابـی عـلـمـا و دینـا

لـربٍ فـاطـر المخلوق فاسجد امـام الـغیــر لا تـخـضع جبینـا

اذا یـخـدعک ذونـور فقل لـه بــأنــی لا احــب الأفــلیــن

بطرفٍ من عصا القهار فاضرب ولا یـفـزعک کیـد الساحرین

وکبـــر انـمـــا الـلّـــه اکبـــر اذا مـا خـار عـجل السـامرین

وادع قــومک مـادمـت حیّاً الـی الـخـالـق الـه العالمین

وامـا الـنـفس والشیطان خالف ولا تتــرک سبیـل الـمـرسلین

الا تـعـلـم بـکـل الارض مـاذا جـری فی فترة من منذرین

اعــاجـم والـعـرب فیهـا سواء تـریٰ هـم فـی هویٰ هم غارقین

فـمــاءً صــافیاً یشـرب غنیـی ویسـقـی غیـره لـدرا وطیـنـا

یـمیتـون البـنـات خـوف عـار ویبـقـون حـمـاتهـم البـنیـن

الا تسـمـع یـقـولـون جهـارا وجهـل فـوق جهـل الـجـاهلین

لـقــد مــنَّ الـه الـعــالـمیـن بتـنـزیـل هـدًی لـلـمتـقیـن

عـلـی الامـی والافـصح لسـانـا فـلـم یـقـرء وفـاق الـقـارئیـن

بصدق الوعد قد امتازفی الکل وقبـل البـعثة یـدعـی امینـا

لـحبلٌ من مسد فی الجید تبت بـامـر الـلّـه ایـدی السـاخرین

واعلن انما الاسلام سلم — بحبل الحق اكل الماسكين
بقلب واللسان واليدين — بعون اللّٰه صيروا مسلمينا
فلا فخر لكم الا بتقوىٰ — و ربى قد يحب المتقين
اشد خصومة لكم عنيد — حذارمن يهود المفسدين
و اشرار ليزد ادون بغيا — لو عاملت بهم رفقا ولينا
بعيش الخلد فى الجنة نفوسا — فان اللّٰه اشترى من مومنين
ليسف من سيوف اللّٰه غرب — بلطف اللّٰه قد مازال فينا
فجاهد فى سبيل اللّٰه يظهر — من القران فضل مجاهدين
فمن خير الانام خيرهدى — حفظنا نعم ذخر الذا خرين
فصل ثم سلم يا الٰهى — على المدعو بختم المرسلين
واهل بيته الاطهار جمعا — خصوصا امهات المومنين
واله كلهم وصحب — كرام اجمعين وتابعين
لقد حمدالحياة بدون جهد — ولكن اننا نصباً لقينا
تركنا السنة فخذلنا جمعا — واُلقينا بايدى الظالمين
لنا اِستغفراللّٰه لجئنا — اليک یا نبى مستغفرين

(١٦/٩/١ء٢م)





هـذه قـصيـدة انشدتها بمناسبة افتتاح اللجنة العربية التى اسست حالا لتدريب الذين يـريـدون ان يتحلو بالآداب العربية ويحسنوا لتكلم باللغة العربيه۔ اتذكر فيها غابر العربان وحـاضرهـم وارجولهم الفوز الكبير فى المستقبل بعون اللّٰه وهو ولى التوفيق۔ اللّٰهم زدهم مفخرة ووفقهم منع حما هم لتجدد لهم المجد الخالد، آمين۔

اهدى هذه القصيده الى:

بنى العروبة

حَـامِلُـوا لُـمَـجْدِ نَاطِقُوْنَ بِضَادِ — قَـــدْ وَرَثْتُـــمْ كَـرَامَةَ الْاَجْـدَادِ

فِـى الْـفَلا حِيْنَمَا الْخمور شَربتم — اَطْـرَبتكُـمْ طُيـور بِـالْاَغْـرَادِ

تَـخْبلُـوْن مِـنَ الْعُيُـوْن وَلٰكِـن — لا نــظيـــر لــجيــد ظبية وَادِىْ

اَنْتُـمْ ابـنَــاءُ غِيُـرَةٍ و شَهَـامَـه — خُضُتُـم كـم معارِک لسعادِ

فَـخُـرُكُم هٰذا لَيْسَ فِيْه شَرِيْک — اُنْـــزِلَ الْـقُــراٰنُ خَيْـرُ رَشَـــادِ

نسـدتُـمُ الارْض كُلّها وَحَكَمْتُمْ — مِنْ دِمَشـق الشّــامِ وَمِنْ بـغْدَادِ

اِنّــكُــمْ مِــنْ صــوارم بَيْـضـــاء — قَـدْ مـحوْتُـم ظَلام كيـد اعَـادِ

سـجّلَ فِـىْ صَـحِيْـفَة التّـاريـخ — بـعـدَ حَــرْقِ السَّـفِيْـنَةِ ابْن زِيَـادِ

فــى حُـدُوْ دِ بـلادِ كـم بِسـلامة — اَعْـلَـنَ كـلّ رائـحٍ وَالـعَـادِىْ

خُـصَّــكُــم رَبّـكُـمْ بسـمـآحة — كـم علٰى المجتمع لكم بايادِى

اُبتُـلِيتــم بــزحـمةٍ فسكـرتـم — وَخــلا كيســكــم حســن زادِ

اِسْتَغَــاث الـمـلاعِنــه فنصرتم — واعــلـــن بـــالــفــور الافســادِ

اَنْـظُـرُوْ واَنْـظرةً شباب عروبه — مــاذا صَهيُــوْن فـاعِـلٌ بـعِنَـادِ

صَـارَتِ الْاَرضُ مِـنْ قَـنَـابِل نَاراً — وَاصْبَغَــتُ مِـن دمٍ تـلول رِمـادِ

سُـلطة الـظّــالِـمِيْنَ فَوْقَ النّبيل — اَوْجَــبَ الشَّــرُ ام الهلاک لِـرَادِ

لَا تـــظـــنّــوْ بِـــاَنّـــهُ لَـوَحِيْـدٌ — اِنّ اَعْــمَـــامَــــهُ مِـنَ الْاَرْصَــادِ

نَــكِّسُـوْا ذا بِسَــاط نـكسـن ثُـمّ　　　اِصــلِبُــوْا ذَا الـلعِيْـن بـالاَوْتَـادِ

اَيْــنَ اَنْتُــم بَـنَـوالْـعَـروُبَـة جيبـوا　　　يـا شَبـاب الحياةُ قدُسُ تُنادِئ

اُنْــظُــرُوْ اِنَّ طَـــائِـرَاتَ تَـطِيْـرا　　　فِـرُقَةُ الـصَّــاعِـقَــهُ لَبـالْمِرُصَـادِ

اُتْـرُكوا الكسل اخوتى فسواكم　　　لـيــس عـن حـوضكم من الزّوّادِ

طَـلْـقَةً ثُـمّ طَـلْـقَةً كــرجــالٍ　　　اســلبـوا عَـن عـدوكـم بسـوادِ

لَيْـت شعْـرى هل الحياة تجمل　　　مـن جـمــال الـحيــاة فتح مرادِ

اِعْـلَـمُـوْا انّــه يـنــاضـل عـنكم　　　بـالـقَـلَـم يَـعْـدِل المُهند، هادى

جَدِّدُوا مِنْ سُيُوْفِكُمْ بِعَلاكم

حامِلوا المجد نَاطِقُوْنَ بضادِ





بائس انی غریب سائل نحوک اسیر　　خذیدی وانصر بجودک عندک الخیر الکثیر

حینما نادِ ینادی ان فصل العرس حان　　کلنا یطرب ویرقص قلبنا شوقاً یطیر

بعد عام قد مضیت فی هیام جئت بابک　　انک غوث غیاث جودک الغیث المطیر

منک لمعان ونور فی قلوب العاشقین　　یا سراج السالکین وجهک البدر المنیر

دائماً یکفل عبیداً سیدٌ من فضل جوده　　لا ابالی ان عجزت انما انت القدیر

کلما افجع بصعب عند ایوانک اناجی　　کیفما کان العسیر للغنی امر یسیر

حبذا شجعتنی من "قاتل عندالقتال"　　انک سیفی ور محی حین عادانی الشریر

ان قلبی لا یبالی بالحلول الحادثات　　یا حبیبی یا مجیبی انت لی نعم النصیر

صاحب الجود العمیم منک فضل فوق فضل　　کیف استو فی المدیح انما شعری قصیر

سیدی سالم و شیخی دام مجداً والکرامه　　یفرح الرائی الیه وجهه الورد النضیر

التفت وانصر ونجّ یا انیس البائسین

فی هموم والمصائب عبدک الهادی اسیر





يا صاحب الجود والاحسان والكرمِ   من لى سواک لا شکو شدة الالمِ

قد کنت تکر منى فوق الجميع لذا   الدهر صبّرنى لحماً على وضمِ

لاذنب لى غير ودٍّ لا افارقه   هل هٰذ امر به قد يستحل دمى

لا کذب فى ان خيراً ما عملت به   والنفس عارية من احسن الشيمِ

ناديتنى وانا فى حضنِ والدتى   والقوم يعرفنى من ذٰلک العلمِ

"فان لى ذمة منه بتسميتى محمداً وهوا وفى الخلق بالذممِ"

يا رب صل على من لا نظير له   فى الخلق وهو رسول سيد الاممِ

سلم وصل عليه دائماً ابداً   والال والصحب من عرب ومن عجمِ

وارض عن التابعين کلهم وعن الـ   غوث المعظم وهو صاحب القدمِ

غوثى اغثنى بجاه العاشقين فهم   قاموا على بابک العالى من القدم

بارک لشيخى تراث الاقدمين فهب   واجعله بدرا منيراً دافع الظلمِ

ذا الهادى البائس العالى يناجيک

يا غوث نج من الاحزان والالمِ





انت الفرید بحسنک وجمالک　　حارت عقول العارفین بحالک

ایاک لقبت المحی وانما　　احییت دین الحق من اعمالک

لزم الخضوع علی الجمیع براسهم　　من عند رب الخلق فی اجلالک

تغشی المریدین بذیل من عبا　　یا غوث فی الدارین من افضالک

اعطیت خیراً من ملیک قادر　　تکفی الانام کسیرة بنوالک

شجعتنی انت العزوم وقاتل　　من لی یخوفنی وبعد مقالک

اذ قلت "لیلٰی فی العراق مریضة"　　ایاک اعنی یا حبیب بذالک

الی نشدتک بالفقیر وجاهه　　انعم علیّ رحمة من نوالک

یاتیک من مِن عاسقٍ یتوسل　　حظ له فی جاهک وبمالک

اکرمت آبای الکرام بسقیهم　　یا لیتنی سقیا بکاس وصالک

یا هادی المسکین هل لک حاجة

یا تیک فضل دائم بسوالک

۱۰/ ۱۱/ ۸۷ھ

۱۰/ ۲/ ٦۸م





هٰذا بیت اللّٰہ بالوادی الامین | فادخلوہ داعیاً مستغفرین
انما هٰذا لبیت اولٌ | شُیّد للّٰہ رب العالمین
وادخلوا بیتاً لابراهیم وابنہ | تغفروا فاللہ خیر الغافرین
طوفوا بالبیت المبارک وانحروا | حیث اسمٰعیل تُلّ للجبین
ایها الحجاج فزتم بالمنیٰ | فاطلبوا من ربکم نصراً مبین
عند ما نا جیتم الرب الرحیم | فاسئلوا نصراً لکل المسلمین
وارحلوا من بعد ما حجیتم | قاصداً بیتاً لختم المرسلین
ایهم جاءوا الیہ راجیا | انما لا قوا شفیع المذنبین
والضحٰی هذا النبی لا ینهر | ایها الاخوان کونوا سائلین
فی البلد مازال مجدٌ مدخر | فابحثو فیہ تراث الاقدمین
فاسئلوا بدراً وایضا خیبرا | لو رجوتم فی حدیث الغابرین
انتم ابناء دین فاجمعوا | شملکم للحق والدین المبین
اعلموا مادمتم فی حزبہ | انما الفوزلکم فی العٰلمین
فی کتاب اللّٰہ قد اُبشرتم | انتم الاعلون صیروا مؤمنین

لا نسیتم بالدعاء هادیاً
صانکم ربی ودمتم سالمین

۲۵/ ۱۱/ ۸۷ھ
۲۵/ ۲/ ٦۸م





شیخ خبیـر بـالکتـاب ومـا بـه

الـمـجتنـی مـن خیـره وصوابـه

فـخـر لـه فـی انـه متعـلـق

مـن صـاحب العلم الشریف وبابه

الـمشـرقـی من علمنا المتعارف

والـمـغـربـی بحـران التقیـابـه

فـازوا ونـالـوا بـالـعلاء ومجدوا

ان الـذیـن استـمسـکـوا بجنابـه

تـدعـو لـه اوربـا جـامـعة بهـا

استـلـزمـت دعـوة لـه بذها به

قـد یشبـه الـلیـل البهیـم ظلامـه

مـا قـد اتـا نـا الـدهـر حین غیابه

شـخـصة لشـمس والعلوم اشعة

قـد اشـرقـت ارض الدکن بایابه

یـعـنیک هـاذتی یا عظیم فضیلة

اکـرم بـه یهـدی الیک بمـا بـه

(۱۹۷۱/۲/۲۸)



نشيد الشبان

يـا نـجـوم الارض طلاب المرام
حــامـلــى رايـات جهد والقيـام
استـمـروا سيـر كـم نحو الامـام
اتـر كـوا واللّـه نـومـا والكسل
اقبـلـو نـحـوالـمـعــالى بـالعمل
وابحثوا فى الكون عن اسمى مقام
لا تبـالـوا بـالـمـصائب والمحن
فى سبيل المجد والحق والوطن
انتـم الاعـلـون يــا ابـنـاء الكرام
مــدد وا ظـل السـلامة والامـان
فـوق كل الانس من قاص و دان
فــى الانــام انـكـم رسل السلام



نذرِ نجم ہمایونِ مصطفوی

۱۳ ھ ۹۰

شاہِ جیلاں آن جوانِ ہاشمی ست زیرِ پائے او ''فرازِ دلبری'' ست

فتح بابِ علم شد بر غوثِ ما سینۂ اش گنجینۂ فیضِ علی ست

پا نہادن زیبدش برگر دناں دلبر و ہم وارثِ حالِ نبی ست

قربِ منزل چیست، خاکِ درگہش چیست عرفاں از مقامش آگہی ست

بر درِ قصرش دہد بوسہ فلک ظلِ رحمت سقف و بنیادش علی ست

تشنگاں مژدہ کہ در میخانہ اُش ساغرِ وصل و مدامِ عاشقی ست

رہبرا وابستۂ دامانِ تو فارغ از اندیشہ ہائے گمرہی ست

سائلاں شاہاں فقیرانت شہا در جہاں اے شیخ کل شاہنشہی ست

للہ المنۃ کہ از روزِ ازل در گلویم طوقِ عشقِ بندگی ست

نیستم زار و ضعیف و ناتواں نسبتِ تو شاہِ جیلانم قوی ست

شاعریٔ ایں گدائے بے نوا پیرویٔ لطفؔ و میخوارؔ و ولیؔ ست

مژدہ باد اے ہادیؔ مدحت سرا

تابشِ بختت ز نجمِ قادری ست

☆☆☆



دستگیرِ خستہ حالاں شاہ جیلانم توئی　　یک شب تاریک غم من صبح خندانم توئی

از غمِ دوراں چرا ترسم کہ درمانم توئی　　نے غلط گفتم کہ درمانم توئی جانم توئی

ہمچومن داری ہزاراں بندگاں بردر گہت　　جز تو مولا کیست یکتا شاہ جیلانم توئی

آں فقیر درگہِ والا سپردت کردہ است　　چیست از فکر و الم کارم نگہبانم توئی

من گدائے باب آنم کو غلامِ پیرہست　　اے شہِ بغداد و جیلاں میر میرانم توئی

طوق عشقت درگلویم در ازل انداختند　　تا ابد نازش کناں رقصم کہ جانانم توئی

وائے بختِ نارسائے حسرتِ محرومِ دید　　جلوہ گر در پردہ ہائے چشمِ حیرانم توئی

من عزوم و قاتل ام بیباک زی فرمودہ ئی　　پس چہ باک از دشمناں دارم کہ پیکانم توئی

بخش سالم راز لطفت موج از محبوبیت　　بیکراں بحرِ نوال وجود جانانم توئی

بردرت چوں لطفؔ و میخوارؔ و ولیؔ حاضر شدم　　بے نوایم خستہ حالم ساز و سامانم توئی

نیست دور از لطف تو شاہا کہ گوئی از کرم
شاد زی اے ہادیؔ مضطر ثنا خوانم توئی





نسیمِ کوچۂ پیر مغاں و زید امروز
نوید کیف بما مے کشاں رسید امروز

ز فرطِ شوقِ فراواں خراب بادۂ وصل
بسوئے میکدۂ قادری دوید امروز

خبر رسید کہ ساقی کشاد میخانہ
غمِ جہاں زدلِ مے کشاں رمید امروز

بہ دل وفور طلب ہست چوں فروغ بہار
ببیں کہ غنچۂ خاطر چو گل دمید امروز

بہم شوند بہ میخانہ میکش و ساقی
رسیدہ است ہماں ساعت سعید امروز

چو او زچہرۂ زیبائے خود نقاب کشاد
فزوں زمستی صہباست لطف دید امروز

سراید از لب ہر برگِ گل عروس بہار
ز فرط شوق، ''نگارا خوش آمدید'' امروز

زفیض مرحمت ساقیٔ سقانی الحب
مے وصال، دل از دیدہ اش چشید امروز

عجب! زلغزش مستانہ ام چو حرف زدم
زلطف، دیدۂ پیرِ مغاں شنید امروز

فروغِ جلوۂ زیبائے پیر میخانہ
بہ مے پرست دہد مستی مزید امروز

مئے کہ دادی بہ میخوآر و جوش و لطف و ولی
ہماں بہ ہادی لب تشنہ ات رسید امروز

(۱۳/۲/۱۹۶۸ء)





بندہ چہ ساز د بیاں خواجہ ز سلطانِ تو
دولتِ دنیا و دیں ہست ہمہ آنِ تو

ہمت زروز ازل طوقِ تودر گردنم
کہ آبا منم بندۂ احسانِ تو

اے بہ جہاں نائبِ رحمتِ عالم توئی
تنگ بمن کے شود وسعتِ دامانِ تو

تو غنی و من فقیر نیست ز لطفت بعید
یا بم اگر من شہا لقمۂ از خوانِ تو

من کہ گدائے تو ام از درِ دیگر چہ کار
در د و جہانم بس ست دستِ زر افشانِ تو

پیر مغاں گفتہ است ہست ز شاہاں بلند
در نظر اہل دل رتبۂ دیوانِ تو

بندۂ آں عاشق و خاکِ نشین و فقیر
ہمرۂ شیخ آمدہ ہم شدہ مہمانِ تو

نیست عجب گر ز لطف بخشی مرا مہا
کوست کہ رفتہ تہی کاسہ ز ایونِ تو

دارم امید از کرم او بدہد جنتم
کے شود از تو جدا بستۂ دامانِ تو

از نگہِ دل نواز خندۂ و رقصاں شود
ہادیؔ افسردہ دل رندِ غزل خوانِ تو

(۱۹۶۱ء)



سراپا

در خوبی و در حسن آفتابے　　عالی مقامے والا جنابے
تفسیرِ طوبیٰ آں قدِ بالا　　زلفِ دراز از رحمت سحابے
ابرو ہلالِ عید تمنا　　روشن جبینش چوں ماہتابے
از چشمِ مستِ خواجہ چہ گویم　　در کیف و مستی جامِ شرابے
بنگر بہارِ رخسار بنگر　　رنگیں شگفتہ خنداں گلابے
گفتارِ شیریں جاں بخشِ دلہا　　چوں کشت زندہ گردد ز آبے
دستے کہ بروے دست خدا ہست　　خلقے ازاں خواہد فتحِ بابے
تاثیر پائے پر نور وے بیں　　ہر ذرۂ خاک ست آفتابے
گفتا کہ ہستی گفتم خرابت　　گفتا چہ خواہی گفتم شرابے

آمد حضورت ہادیؔ مضطر
باچشمِ گریاں حالِ خرابے

(۱۹۶۱ء)

☆☆☆



جشنِ نوروزِ گل و قل کا مہینہ آیا   جوش پر رنگِ بہارِ خم و مینا آیا
ہاتھ اس رند کے مستی کا خزینہ آیا   مست ساقی کی نظر سے جسے پینا آیا
لو مبارک درِ میخانہ کھلا میخوارو   رفعتِ کوثر و تسنیم کا زینہ آیا
غرقِ مے کر دیں غمِ دہر کو آؤ یارو   پیر میخانہ لیے ساغر و مینا آیا
رنجِ دنیا نے ہمیں مار ہی ڈالا ہوتا   کیف صہبائے غمِ عشق سے جینا آیا
رحمتِ کل کی ہوئی حشر میں آمد آمد   مہر محشر کو خجالت سے پسینہ آیا
نا تمام آرزوئیں بن گئیں دل کی دھڑکن   لذت تشنگیٔ عشق سے جینا آیا
تھا ہی کیا پاس بجز داغ غم عشق نبی   ان کی نظروں میں یہی ایک نگینہ آیا
چاندنی چھٹکی ہے ہر سمت دلِ مضطر میں   یاد جس وقت سمن زارِ مدینہ آیا
پایا میخوار نے جب سلسلۂ پیر مغاں   کیف صہبائے یقیں سینہ بہ سینہ آیا
دیکھو کس طرح چڑھاتا ہے غٹاغٹ ساغر   بادہ کش میں اثرِ قلقلِ مینا آیا
پیرِ میخانہ سلامت رہے اس کے ہاتھوں   دور میں ساغرِ صہبائے مدینہ آیا
لطفؔ و میخوارؔ و ولیؔ کی ہے کرامت ساقی   مجھ سے نااہل کو شغلِ مئے و مینا آیا

ہادیؔ زار کو دیکھا تو یہ بولے قدسی
اے لو وہ بلبلِ بستانِ مدینہ آیا





کھول دے بندِ نقابِ رخِ زیبا کوئی
جیب سے بھی نہ نکالے یدِ بیضا کوئی

طالب دید رہا تاحدِ سینا کوئی
محو نظارہ سرِ عرشِ معلّٰی کوئی

ایسا رکھتا ہی نہیں قرب خدا کا کوئی
دل ہے یا محرم اسرار تجلا کوئی

پائے مالک سے ہے مازاغ کا تمغہ کوئی
جز ترے رکھتا نہیں دیدۂ بینا کوئی

بزم ہستی میں اجالا ہی اجالا ہوگا
لے کے آیا ہے چراغ رخِ زیبا کوئی

میں یہ سمجھوں کہ ملی میری نظر کو معراج
دیکھ پاؤں، جو تجھے دیکھنے والا کوئی

ایسے ''اثنین'' کہ کونین میں لاثانی ہیں
اُن سا محبوب، نہ صدیق سا شیدا کوئی

ہے یہی سب کو بلانے کا سبب محشر میں
دیکھیں سب بخشے جو انعام فتــــرضٰــــی کوئی

اب اسی در سے ہی مل جائے گا صدقہ ہادیؔ
کام رکتے نہیں دیکھا کبھی تیرا کوئی





پوچھا جو کیف ساقیٔ بزمِ الست نے
وحدت کا جام چوم لیا مے پرست نے

لا کو بھی غرق جام کیا مے پرست نے(۱)
خلعت وجودِ ذات کا بخشا ہے ہست نے

صورت دکھائی اپنی حبیبِ الست نے
اقرار بندگی کا کیا ہر چہ ہست نے

دیکھا نہیں کہیں بھی کسی مے پرست نے
پیدا کیا نہ ان سا کسی بھی گھرست نے

ظاہر کی تشنگی نگہٗ مے پرست نے
سب بخش ڈالی ساقیٔ مینا بدست نے

مژدہ دیا جو خلد کا ربِ الست نے
ما تشتہی کو جمع کیا بندوبست نے

نعرہ لگایا پی کے ادھر مے پرست نے
پہنچا دیا صراط کے اس پار جست نے

حوران خلد بھرنے چلیں ساری نعمتیں
تنگی کا اپنی شکوہ کیا ان کے طشت نے

کوئی نگاہ جن کا تصور نہ کر سکے
جلوے وہ سارے دیکھ لیے چشم مست نے

میخانۂ بہشت کے ایوان گونج اٹھے
نعرے وہ بیخودی میں لگائے کسی مست نے

ساقی نے مُغبچوں سے کہا تم پلائے جاؤ
ایسی لگائی اور کی رٹ مے پرست نے

چمکائے یوں قلوب کہ احیائے دیں ہوا
جلوہ دیا جو رہبر ظلمت شکست نے

حاجت بیان کرنے کی حاجت نہیں رہی
دروازہ ان کا دیکھ لیا تنگ دست نے

پابندیوں سے ساری وہ آزاد ہو گیا
پس خوردہ جس کو بخش دی ساقیٔ مست نے

ہادؔی خمارِ عشق کا ساغر چھلک اٹھا
ایسی پلائی بے خودیٔ چشم مست نے



۱۔ حضرت اقدس نے جب ارشاد فرمایا تھا کہ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو تم سے اس کے متعلق سوال بھی نہیں ہوگا، تھوڑا وقت نکالو میں فصوص پڑھا دوں پھر سمجھ میں آجائے گا۔ میں نالائق تیار نہ ہوا کہ جب مجھ سے سوال نہیں ہوگا تو میں خود کو کیوں پھنساؤں۔ تو ارشاد ہوا ''ٹھیک ہے مگر مسئلہ کا انکار نہ کرنا، مسئلہ حق ہے جو اسے سمجھ سکتے ہیں ان سے سوال بھی ہوگا''، اس لیے یہ شعر کہا، کہ مسئلہ حق ہے تو ''لا'' کا گزر نہیں ہوسکتا۔ (ہادی القادری)



جامِ دل ٹوٹ کے قیمت مانگے
تیری صہبائے محبت مانگے

شوقِ نظارہ قیامت مانگے
یعنی صبحِ شبِ فرقت مانگے

کس لیے اجرِ عبادت مانگے
مانگنا ہی ہے تو رحمت مانگے

عرصۂ حشر میں جس کو دیکھو
سایۂ دامنِ رحمت مانگے

اچھے اچھوں نے سیہ کاروں سے
گوہرِ اشکِ ندامت مانگے

چارہ گر کس لیے فکرِ درماں
درد ہی درد کی لذت مانگے

تم سے اے خاک نشیں ہادیؔ زار
تھوڑی خاک درِ دولت مانگے



☆

دل کی پونجی حضور کا غم ہے
عشق کا فیض عالم عالم ہے

سائے میں جس کے سارا عالم ہے
رحمت عالمیں کا پرچم ہے

سب پہ بھاری یہ عشق کا غم ہے
ورنہ مجھ ناتواں میں کیا دم ہے

ذکر جنت کا عالم عالم ہے
وہ مدینے کی گلیوں میں ضم ہے

ہو اگر مہر حشر برہم ہے
ان کے سائے میں ہم ہیں کیا غم ہے

جس سے کھل اُٹھے پھول دامن میں
اشک خونیں مثال شبنم ہے

کیوں نہ دل مستیوں میں رقص کرے
جلوہ گر اس میں آپ کا غم ہے

عشق نے تازہ زخم بخشے ہیں
آج کچھ دردِ زندگی کم ہے

لو نظر آیا قبۂ خضرا
آرزؤوں کا اور عالم ہے

دل میں آتا نظر مدینہ ہے
مفت مشہور ساغر جم ہے

عرصۂ حشر میں ہر اک لب پر
یا شفیع الوریٰ ترحم ہے

صرف صدیق انبیا کے بعد
افضلِ خلقِ ابنِ آدم ہے

دفع ابلیس کے لیے بے شک
نامِ فاروق اسمِ اعظم ہے

کیوں نہ مشہور ہو وہ ذوالنورین
زوج دو دختِ شاہ عالم ہے

رشتۂ بو تراب و دین مبیں　　　عہد طفلی سے ہی مسلّم ہے
بدر کے معرکے میں ہر اک سر　　　شیر حمزہ کے سامنے خم ہے
وارثِ حالِ سرورِ کونین　　　وہ جو مشہور غوثِ اعظم ہے
شمسِ دینِ مبیں کی کرنوں سے　　　چہرۂ عین حق چماچم ہے
مستؔ ساقی نے بخشا ساغر وصل　　　مستیوں کا عجیب عالم ہے
شاہِ جیلاں کے آستاں کے فقیر　　　تیری دریا دلی مسلّم ہے
ہے جو غوث الوریٰ کا خاک نشیں　　　تیرے ہی در پہ میرا سر خم ہے
رنجِ دنیا سے چھین لے ہتھیار　　　ان کے عاشقؔ میں ہی یہ دم خم ہے
شیخ سالمؔ کے ہاتھ سے ساغر　　　ملتا ہے میکشوں کو کیا غم ہے
لطفؔ و میخوارؔ و بسملؔ و منظورؔ　　　ان کے نغموں کا خاص عالم ہے

وہ ہمارے ہوں ہے بلند مقام
ہادیؔ ہم ان کے ہیں یہ کیا کم ہے

(۱۱/۱۲/۱۹۸۵ء)

☆☆☆

بتعمیل ارشادشبہ ما

۱۴۰۴ھ

نغمۂ دردمحیط

۱۴۰۴ھ

انفاس غریب

۱۴۰۴ھ

گدائے خاک نشیں پیشگاہ

۱۴۰۴ھ

مطلع اوّل

گریۂ نیم شب وآہ سحر بے تاثیر
کیسی گردش ہے کہ بنتی نہیں کوئی تدبیر

کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا مسرت کا نشاں
ہے زمانے میں تو بس درد و الم کی توفیر

تیرِ باراں کیے جاتی ہے زمانے کی ہوا
آہ دلدوز سے ہر ایک کا دل ہے نخچیر

دیکھو سیرِ گل و گلزار تو مقتل کی نوید
نظر آتی ہے ہر اک خواب کی الٹی تعبیر

خیمہ زن ہے دل تیرہ میں ہمیشہ شبِ تار
ہائے خورشید کی کرنیں بھی ہیں کیا بے تنویر

زندگی کیسے کہیں اس کو کہ ہر دم ہے یہ ہول
جانے اب کس کا گلا آتا ہے زیرِ شمشیر

بس کہ بازار جہاں میں ہے محبت نایاب
خشمگیں ایسی نگاہیں کہ برستے ہوئے تیر

سب سے بڑھ کر تو یہ آفت ہے کہ اب اہلِ جہاں
اس مصیبت کو سمجھنے لگے اپنی تقدیر

کیوں پریشان ہے کر عرض اسی کے در پر　　جس نے بخشی ہے تجھے ملک سخن کی جا گیر

مطلع دوم

مدح حضرت عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی قدس سرہ

وہ غنی ابن غنی سر و گلستانِ فقیر　　قبلہ و کعبۂ جاں رہبر دیں عبد قدیر
شاہِ بغداد کی الفت کا مرقع وہ ذات　　عشق سرکارِ رسالت کی وہ گویا تصویر
وہ تلطف وہ تبسم وہ نظر کیف آگیں　　اس کی ہر ایک ادا دل کے لیے دامن گیر
مجلسِ علم میں صدرِ علماے اعلام　　صف احرار میں شامل ہے وہ باندھے شمشیر
تا کہ ہو ملک کے صناعوں کی صنعت کو فروغ　　پہن لے گاڑھا گزی چھوڑ کر دیبا و حریر
مل گئی تھی یہ بشارت تو بہت پہلے ہی　　راہ بغداد میں چلنا ہے اسے بن کے اسیر
غم کو لے جائیں بہا کر متبسم نظریں　　موجیں لیتا ہوا دریاے فصاحت تقریر
خمرِ فارض کا جھلکتا ہوا آنکھوں میں خمار　　اور وہ جرعہ کش بادۂ میناے امیر
وہ ہے وہ تحفہ کہ بغدادِ معلیٰ اُس کو　　پیش کرنے کے لیے لے گیا خود اس کا پیر

مطلع سوم

مدح سرکار صاحب الاقتدار شاہ عبدالمقتدر مطیع الرسول قادری قدس سرہٗ

عینِ حق کے مہِ تابندہ سراپا تنویر　　ساقیٔ میکدۂ عشق دل و جانِ فقیر
''مقتدر خاک نشینِ در غوث اعظم''　　ذرہ پر نور ز تابندگی مہرِ منیر
اس کے نظارے میں ہے خیر قروں کا جلوہ　　سیرت ختم رسل کی وہ مکمل تصویر
منزل قرب میں ہر آن ملے وصل حبیب　　اس نے ہر خواہش دنیا کو کیا بے توقیر
پاس انفاس کہ ''انت'' کی صدائیں آئیں　　طاعت و زہد میں کہیے اسے آپ اپنی نظیر

اللہ اللہ مرے سرکار کی وہ شان وصال
سجدۂ و قرب الٰہی کی حقیقی تفسیر
مٹ نہیں سکتا کبھی دوری و مہجوری سے
عشق اس کا ہے مرے دل میں کہ پتھر کی لکیر
ہے یقیں مجھ کو نہ پہنچے گا کبھی کوئی گزند
گرتے گرتے جو کہوں ''مقتدرا دستم گیر''
مجھ سے فرمائیں کہ چل اس سے کہیں تیرا حال
وہ کہ ہے مملکت فقر و غنا کا جو امیر

مطلع چہارم

مدح تاج الفحول محبّ رسول شاہ عبدالقادر قادری قدس سرہٗ

آستانِ شہ بغداد کا مخصوص فقیر
فیضیاب اس سے زمانے کے صغیر اور کبیر
مظہر و مُظہر حق علم و عمل کا پیکر
اس کے ہر لفظ میں اک سحر، نظر میں تسخیر
وہ سبھی جن کو ملا علم سے رتبہ عالی
کہتے ہیں سارے زمانے میں اسی کو نحریر
حق و باطل میں کوئی شبہ کا امکاں نہ رہے
دل میں کر جائے جو گھر ایسی مدلل تقریر
چل نہیں پایا روافض کا وہ مکرِ تفضیل
کھول دی مجمع گمراہ کی ہر اک تزویر
کبھی چہرے سے اشداؤ کی ہیبت کا ظہور
کبھی نظریں رحماؤ کی مکمل تصویر
رد کیا ایسے کہ ہو جائیں مکائد ظاہر
جس کو ہر ایک سمجھ لے وہ شگفتہ تحریر
سعی میں اس کو معیت کا شرف بخشا گیا
عزت افزائی کرے ایسی وہ سب پیروں کا پیر
چھوڑ کر جام و سبو اس کی طرف کو دیکھو
دیکھنا چاہو اگر مست نظر کی تاثیر

مطلع پنجم

مدح سیف اللہ المسلول سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی قدس سرہٗ

ساقیٔ بادہ کشاں، مست، مئے حب امیر
جلوہ بے پردہ دکھائے جسے سب پیروں کا پیر

ہے کبھی ''مظہر محمودؔ'' کبھی ''مظہر حق''
رنگ تو عینی معینی ہیں مگر اک تصویر

زیب سر علم کی دستار ہے خرقہ بردوش
دل ہے دنیا سے نفور، عقل میں ہے فہم وزیر

جب اٹھا غلغلۂ فتنۂ قرنِ شیطاں
مذہب حق کی حمایت میں مہند شمشیر

فن طب کا ہے کرشمہ کہ تصرف اس کا
وہ اگر خاک بھی بخشے تو بنے وہ اکسیر

شاہ بغداد کے الطاف و کرم نے اس کو
بخش دی ارض بسیط اور ہوا کی تسخیر

جس طرف ہو کے گزر جائے وہ گلشن بہ کنار
اس گزر گاہ میں ہو رائحہ مشک و عبیر

خاک اس کے در اقدس کی جبیں پر مل کو
بخت کو سعد بنا دے گی یہ روشن تحریر

چاہیے اس کو کہ دے باب مجیدی پہ صدا
ہو گیا ہو جو کوئی گردشِ دوراں کا اسیر

مطلع ششم

مدح حضرت شاہ عین الحق عبدالمجید قادری قدس سرہٗ

شمس مارہرہ کے پرتو سے بنا بدرِ منیر
نور نے اس کے کیا ملک دل و جاں تسخیر

عینِ حق، مظہرِ فیضِ برکات، عبد مجید
ملک عرفاں کا جسے بخشا گیا تاج و سریر

ہر کڑی میں وہی جھنکار وہی تابانی
قادری سلسلہ ہے ایک مُذَهَّبْ زنجیر

بس کہ ہے کاشف استارِ حقیقت جلوہ
قلب تیرہ کو جلا بخشے نظر کی تنویر

رہتا ہے اس کے لیے بیت کشادہ آغوش
وہ کہ جو عتبۂ محبوب سے ہو لذت گیر

قرب یہ ہے کہ اٹھا دے وہ اگر دستِ دعا
فضلِ مولا سے سنور جاتی ہے بگڑی تقدیر

عینِ حق ہیں یہ پکڑ لے جو کوئی ان کا ہاتھ
گویا پکڑے ہوئے اللہ کی ہے حبل مریر

شاذ ہوتا ہے کوئی ایسا فدا کار مرید
وہ ارادت کی ادا ناز کرے جس پر پیر

اس کو دنیا کے غم و درد سے آزادی ہے
جو دل و جاں سے ہوا ان کی محبت میں اسیر

مطلع ہفتم

عرض پرداز ہے سرکار کا اک عبد حقیر
پہنے ہے فخر غلامی کے جو طوق و زنجیر

اس دلِ تار میں کتنی ہی تمنائیں ہیں
سب سے پہلے نگہِ لطف سے عفو تقصیر

شیخ سالؔم سے فزوں زینت سجادہ ہو
ان سے ہو اہلِ ارادت کے دلوں میں تنویر

مثل میخوارؔ و ولؔی، لطفؔ و صبؔا و منظورؔ
یہ گنہگار بھی ہو تیری محبت میں اسیر

اور اگر زیست کی لذّت مری قسمت میں نہیں
یہ تو ممکن ہے بدل جائے یہ کھوٹی تقدیر

تیرا بیمار شفا پائے عطا ہو صحّت
اور وہ عیش فراواں سے رہے لذت گیر

تیرے الطاف وعنایت سے ہو پورا مرا کام
میں تو ناکارہ ہوں بنتی نہیں کوئی تدبیر

میں جہاں بھی رہوں تیری ہی حفاظت میں رہوں
تا کہ بہکا نہ سکے دل کو کبھی نفسِ شریر

ہادؔی زار بہرحال ہے اس در کا گدا
اس کے انجاح مقاصد میں نہ ہو اب تاخیر

☆☆☆



یورشِ رنگ و بو سے کیا ہوگا
جانتے پھر رفو سے کیا ہوگا

آرزو سے ملا ہے کیا اے دل
حسرتِ آرزو سے کیا ہوگا

پھول ہر سو کھلیں جہاں مہکے
ایک دل کے لہو سے کیا ہوگا

ساتھ چھوڑیں گے یاد کے پیکر
شغل جام و سبو سے کیا ہوگا

دل ہو جکڑا وفا کے رشتے میں
صرف طوقِ گلو سے کیا ہوگا

میں تری جستجو میں کھویا ہوں
اب مری جستجو سے کیا ہوگا

رک سکے گی بہار پل دو پل
ماتم و ہاؤ ہو سے کیا ہوگا

چاہیے اک جنوں طلسم کشا
اس خرد حیلہ جو سے کیا ہوگا

خاک ڈالو بگولوں کے سر پر
ہوں جو ہیں تند خو سے، کیا ہوگا

''آپ'' کی حد کو پار کر لیں آؤ
ورنہ اس ما و تو سے کیا ہوگا

سب تو کہہ سن لیا نگاہوں نے
حاصل اب گفتگو سے کیا ہوگا

شعر مانگے ہے خونِ دل ہادؔی
آرزو کے لہو سے کیا ہوگا





ہاں قاتلِ دل، بائ جفا جز وہم تمنا کوئی نہ تھا
دزدیدہ نگاہِ جانِ حیا کیا تیرا اشارا کوئی نہ تھا

وہ دیکھتے کیا سن بھی نہ سکے شاید کہ فغانِ دیدۂ و دل
اے حسنِ تغافل تیرے سوا کہنے کو بھی پرداکوئی نہ تھا

وہ دل کہ دھڑکنا بھول گیا سینہ میں تڑپتا کس لیے ہے
اے شورِ قیامت تیری قسم یہ پوچھنے والا کوئی نہ تھا

تھا غم ہی غمِ ہستی بھی مگر ان کے غمِ پنہاں تیرے بغیر
مرنے کے بہانے لاکھ سہی جینے کا سہارا کوئی نہ تھا

اٹھتی ہے نگاہِ اہل جنوں اب غنچۂ و گل کی خیر نہیں
گلشن میں بہار اترائی بہت جب محوِ تماشا کوئی نہ تھا

اب دور نہیں وہ دن بھی کہ تم انجامِ تغافل دیکھ سکو
اس وقت بھی اپنے غم کی قسم تم یہ ہی سمجھنا کوئی نہ تھا

وہ کہتے ہیں ہادؔی خوب ہو تم مرتے ہو مگر مرتے ہی نہیں
مرنے کے لیے جینے کے سوا کیا کہیے کہ چارہ کوئی نہ تھا

(۱۹۵۳/۲/۸ء)



رات کیوں آتی ہے ہر سمت بکھیرے تارے
جانے کس دل کے پراگندہ خیالوں کی طرح
وائے ناقدریٔ ایام کہ سمجھا جاؤں
اپنی محفل میں ہی نادیدہ جمالوں کی طرح
حسن مغرور کی دزدیدہ نگاہی توبہ
قلب مرحوم کے ناکردہ سوالوں کی طرح
چشمِ پر آب کی قسمت میں نہ تھی کوئی کرن
چاہے برسات کے کجلائے اجالوں کی طرح
بزم عشرت کے دمکتے ہوئے گورے چہرے
دل میں انسان کے ڈس لیتے ہیں کالوں کی طرح
غیر کے ذہن سے سوچو تو ہماری ہستی
مضحکہ خیز ہے سنجیدہ خیالوں کی طرح
ہائے یہ گرسنہ امید کہ تارے دیکھے
جو نظر آتے ہیں اوندھے ہوئے پیالوں کی طرح
ٹکٹکی باندھے ہوئے دور سے دیکھے جاؤ
زندگی بن گئی رم خوردہ غزالوں کی طرح
وہ بھی دن دور نہیں ذکر تمہارا ہادؔی
لب پہ آئے گا مگر فن کی مثالوں کی طرح

(۱۹۷۲ء)

☆☆☆

بیت بازی

﴿الف﴾

اُف بھی کریں تو ہم نہیں وارفتگانِ شوق — سو تیر ناز و غمزہ کرو دل کے آر پار

اعجازِ چشمِ شوقِ تصور تو دیکھئے — اک بے نگہ نگاہ تھی محمل کے آر پار

اب اس مقام پر ہے یہ مشتاقِ تیز گام — اک رہگذارِ شوق ہے منزل کے آر پار

آدابِ ضبطِ درد اگر بیچ میں نہ آئیں — آہِ جگر خراش تھی محفل کے آر پار

﴿ب﴾

بجلی چمک رہی تھی ابھی آشیاں سے دور — دھڑکا تو تھا قلوب عنادل کے آر پار

بارِ دگر وہ سامنے آتے ہیں، خیر ہو — پہلی نظر ہی جن کی ہوئی دل کے آر پار

بسمل کو خوں بہا کی ضرورت نہیں رہی — دل کا لہو ہے خنجرِ قاتل کے آر پار

برما گئی نگاہِ غضبِ قلبِ زار کو — جس طرح کوئی بور کرے سِل کے آر پار

﴿پ﴾

پھر اس طرف وہ دیکھتے ہیں تان کر بھنویں — ہوتی ہے ہائے تیغِ دو دم دل کے آر پار

پہنچا جو تھک کے منزلِ مقصد پہ پائے شوق — راہیں نکالیں عزم نے منزل کے آر پار

پاپی پپیہے! ہائے تری پی، کہاں کی کوک — اک زخم ڈالتی ہے مرے دل کے آر پار

﴿ت﴾

تم نے تو ایک ''اُونھ'' سے کیا قصہ مختصر — اک تیر ہو گیا دلِ سائل کے آر پار

تیرِ نگاہِ ناز سے بچتا نہیں کوئی — بے روک ٹوک ہوتا ہے ہر دل کے آر پار

''تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں'' کس کی نظر کا تیر ہوا دل کے آر پار

﴿ٹ﴾

ٹوٹا طلسمِ خواب، حقیقت عیاں ہوئی تاریکیاں جھلکتی ہیں جھلمل کے آر پار

ٹھہرے گا کس مقام پہ اب کاروانِ شوق بے نام راہ جاتی ہے منزل کے آر پار

ٹکرائی چشمِ شوق جو ان کی نگاہ سے کیا چیز تھی کہ ہو گئی بس دل کے آر پار

﴿ث﴾

''ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما'' وہ کیا مرے گا عشق ہو جس دل کے آر پار

ثابت ہوا کہ تیر قضا سے مضر نہیں اٹھتے ہی وہ نگاہ ہوئی دل کے آر پار

ثانی کہاں سے آئے گا اس بے مثال کا پہلی نظر ہی جس کی ہوئی دل کے آر پار

﴿ج﴾

جب بھی نگاہِ شوق اٹھی وہ سنبھل گئے شاید کہ ہو وہ پردۂ محمل کے آر پار

جرمِ نگاہِ ناز کی اتنی کڑی سزا اک موجۂ عتاب ہوئی دل کے آر پار

جب یاد آ گئی ہیں وہ محشر خرامیاں خوابیدہ آرزوئیں ہوئیں دل کے آر پار

﴿چ﴾

''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' چاہے ہوا کرے جگر و دل کے آر پار

''چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں'' سنبھلا نہ تھا عدو کہ ہوئی دل کے آر پار

''چھٹتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے'' چھینٹے ہیں خوں کے دامن قاتل کے آر پار

﴿ح﴾

حاصل یہی کہ خیر سے حاصل نہیں کوئی یہ میرا غم ہے کیوں ہو کسی دل کے آر پار

حسرت نکالی دیدۂ محرومِ دید نے دیکھا ہے خوب خنجرِ قاتل کے آر پار

حیرت بنی حجابِ رخِ بے نقابِ دوست　　ہنس ہنس کے دیکھتے رہے وہ دل کے آر پار

﴿خ﴾

خمیازۂ حیات ہے وہ کیفِ دردِ عشق　　ہو دھڑکنوں میں جس کی خلش دل کے آر پار

خار الم سے ہوگی نمودِ بہارِ نو　　ہونے تو دو قلوبِ عنادل کے آر پار

﴿د﴾

دل کیا گیا غموں سے فراغت ہی مل گئی　　اب اک خلا ہے سینۂ بسمل کے آر پار

داغ فراق کوئی نظر پائے گی کہاں؟　　مدت ہوئی کہ ہو گئے وہ دل کے آر پار

''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو''　　حسرت کے کتنے زخم ہیں اس دل کے آر پار

﴿ڈ﴾

ڈالی جدھر بھی ایک اچٹتی ہوئی نگاہ　　بجلی تڑپ کے ہوگئی ہر دل کے آر پار

ڈوبے ہیں جو محیطِ غمِ عشقِ دوست میں　　وہ ہو گئے ہیں موجۂ و ساحل کے آر پار

ڈھونڈا تو ایک غم ہی ملا حاصلِ حیات　　حسرت کے چند زخم رہے دل کے آر پار

﴿ذ﴾

ذوقِ جراحتِ غمِ پنہاں کی خیر ہو　　ہوتا ہے لطف سینۂ بسمل کے آر پار

ذرہ ہے آفتاب کی طلعت لیے ہوئے　　جلوے جھلک رہے ہیں مرے دل کے آر پار

ذکرِ بہار اور اسیروں کے سامنے؟　　موجِ صبا نے تیر کیے دل کے آر پار

﴿ر﴾

''رانجن شعاع'' بن گئی میری نگاہِ شوق　　نکلی ہے صاف صاحب محمل کے آر پار

راحت اسی کا نام ہے دنیائے عشق میں　　ہو شوق و آرزو کی کسک دل کے آر پار

رازِ درونِ سینہ زباں تک نہ آ سکا　　سوزِ غمِ فراق ہوا دل کے آر پار

﴿ز﴾

زہراب زندگی ہے غمِ عشق تو نہیں — وہ دل کی آبرو تھا یہ ہے دل کے آر پار
زخمہ زنِ حیات کی بیدردیاں نہ پوچھ — ضربوں کے ساتھ زخم ہوئے دل کے آر پار
زیر و زبر ہے عالمِ زنداں کا انتظام — شورِ فغاں ہے طوق و سلاسل کے آر پار

﴿س﴾

سرکار دل پہ بھی تو لگا دیجے بندشیں — جوشِ جنوں ہے قیدِ سلاسل کے آر پار
ساری ہے فیضِ چشمِ فسوں ساز ہر طرف — ہے شوقِ نا تمام ہر اک دل کے آر پار
ساغر سے چھلکے بادۂ گلفام جس طرح — ویسے ہی حسرتیں دلِ بسمل کے آر پار

﴿ش﴾

''شوقِ فضول و جرأت رندانہ چاہیے'' — آسانیاں ہیں عقدۂ مشکل کے آر پار
شاید اسی کو کہتے ہیں خندہ بسوریاں — ہنستے ہیں درد ہوتا ہے جب دل کے آر پار
شفاف مثلِ جامِ بلوریں ہے لوحِ دل — جھلکے ہے تیرا شوق مرے دل کے آر پار

﴿ص﴾

صورت کا حسن کیا ہے جو سیرت بھلی نہ ہو — الماس کی کنی ہے کہ ہو دل کے آر پار
صبحِ بہار و گوشۂ تنہائی قفس — ہو ہو گئی ہر ایک کرن دل کے آر پار
صرصر کی موج موج اڑاتی ہے برگِ گل — کرتی ہے تیر قلبِ عنادل کے آر پار

﴿ض﴾

ضد اور کیسی ''پیاز کا گودا نکالیے'' — سمجھائے کون؟ ہوتے ہیں بس چھلکے آر پار
ضو ریز سوزشِ دلِ پروانہ ہو گئی — فانوسِ شمعِ رونقِ محفل کے آر پار
ضائع نہیں گیا تری ترچھی نظر کا تیر — سیدھا وہ ہو گیا ہے مرے دل کے آر پار

﴿ط﴾

طوفان ناز ہوتا ہے ساحل سے بے نیاز — موج اک ادا سے ہوتی ہے ہر دل کے آر پار
''طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھاتے'' — کی تھی نظر کہ درد ہوا دل کے آر پار

''طرزِ خرامِ ساقی و ذوق صدائے جنگ'' دونوں ہی آفتیں ہیں مرے دل کے آر پار



ظلم اس ادا سے کرتے ہیں احباب ان دنوں جیسے کہ برما ہوتا ہے مل مل کے آر پار
ظاہر پرست دیکھ سکے مسکراہٹیں وہ درد و غم نہیں جو ہوا دل کے آر پار
ظرف آزما رہے ہیں وہ ارباب ذوق کا رہنے نہ پائے کچھ جو نہ ہو دل کے آر پار



عالم ہے داغِ آرزوئے کو بہ کو کا نام وہ جی اُٹھا کہ غم ہوا جس دل کے آر پار
عزمِ بلند و شوقِ فراواں نہ پوچھیے کتنے جہاں ہیں جادہ و منزل کے آر پار
عرضِ نیازِ شوق پہ تیوری چڑھا کے دیکھ ایک اور وار سینۂ بسمل کے آر پار



غنچہ سے پھول، پھول سے پژمردہ برگِ گل خارِ الم قلوبِ عنادل کے آر پار
غم ہائے دہر سے اسے مل جاتی ہے اماں پیکانِ دردِ عشق ہو جس دل کے آر پار
غیر از نگاہ پردۂ حائل نہیں کوئی سو بار دیکھا پردۂ محمل کے آر پار



فرزانگی ہے نور مگر نور بھی تو بس ہوتا ہے صرف جوہرِ قابل کے آر پار
فانوس نورِ شمع مقید نہ کر سکا ہے ان کا جلوہ پردۂ محمل کے آر پار
فرقِ بیانِ ما و شما گفتنی بود آؤ نکل چلیں حد فاصل کے آر پار



قرباں اس ایک نیم نگاہی پہ لاکھ دل جو دیکھتے ہی دیکھتے ہو دل کے آر پار
قائل نہیں ہے کون کسی کی نگاہ کا ہر آن دیکھتی ہے وہ ہو دل کے آر پار
قانع کسی کے تیرِ نظر پر نہیں ہے شوق پیکانِ غم خود اس نے کیے دل کے آر پار



کیا جانتے کہ پہنچے کہاں کاروانِ شوق جادہ بنائے جاتا ہے منزل کے آر پار
کافور ہو گئیں غمِ دنیا کی کلفتیں جب ان کا دردِ عشق ہوا دل کے آر پار
کب ہوگی صبح، صبح تمنا کہیں جسے ایسی نہیں کہ زخم کرے دل کے آر پار

﴿گ﴾

''گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر'' جو بات کی وہ ہو گئی بس دل کے آر پار
گرمِ خرامِ ناز ہے موج اک ادا کے ساتھ ہے پا شکستگی دلِ ساحل کے آر پار
گم ہو گئی کلرک کے فیتہ میں زندگی کس کی مجال دیکھ لے فائل کے آر پار

﴿ل﴾

لے! آئی یاد شمعِ فروزاں لیے ہوئے دل! ہوگی روشنی تری محفل کے آر پار
لَو دے اُٹھے ہیں داغِ تمنا شبِ فراق شعلے لپکتے ہیں جگر و دل کے آر پار
لازم ہے ذوقِ دید بہ اندازۂ جمال کر پھر نگاہ پردۂ حائل کے آر پار

﴿م﴾

مشکل ہے خالِ لب کی حلاوت کی گفتگو یہ کہیے تیز چاشنی ہے تل کے آر پار
ملتے ہی ان کی چشمِ فسوں ساز سے نظر پیکانِ ناز و غمزہ ہوا دل کے آر پار
''منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی'' کرنا نہیں ہے طعن کسی دل کے آر پار

﴿ن﴾

نرغہ ہے دردِ عشق و غمِ روزگار کا ہر ایک چاہتا ہے کہ ہو دل کے آر پار
نظریں ملیں تو ہوش کسے تھے کہ ہو خبر کب آیا تیر کب ہوا وہ دل کے آر پار
''نظریں ملا کے آپ نے افسانہ کردیا'' وہ دردِ بے پناہ کہ تھا دل کے آر پار
''ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں'' ہے کون جس کے تیر نہ ہو دل کے آر پار
نظروں کی قید سے ہے جو آزاد چشمِ شوق ہم دیکھ لیتے ہیں تری محفل کے آر پار

﴿و﴾

وہ تیرِ بے کماں جسے ان کی نظر کہیں
ہوتا ہے مثلِ برق وہ ہر دل کے آر پار

واماندگی سے شوقِ فراواں کو بیر ہے
نکلا چلا گیا حد و منزل کے آر پار

وارفتگان شوق میں نظروں سے بے نیاز
وہ دیکھتے ہیں پردۂ حائل کے آر پار

''وہ بے رُخی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں''
ہونے دو زخم ہوتا ہے گر دل کے آر پار

وہ زخم دے گئے ہیں کہ آتی رہے گی یاد
اچھا ہے راستہ رہے منزل کے آر پار



ہر صبح و شام وعدہ فراموشیوں کے ساتھ
اک تازہ زخم ڈال دیا دل کے آر پار

ہوتے ہیں سنگ دل کبھی آنسو سے ٹس سے مس
بوندیں پہنچ بھی سکتی ہیں کیا سل کے آر پار؟

ہے کیا ہی خوب چارۂ محرومیٔ حیات
تیرِ قضا کہ ہو دلِ بسمل کے آر پار



یہ کون آ رہا ہے کہ جی سَن سے ہو گیا
آہٹ سی تھی کہ تیر ہوا دل کے آر پار

یہ ہیں تصورات کی پرواز کی حدیں
ہے پردۂ تعین حائل کے آر پار

یوں دیکھتے ہیں جیسے اِدھر دیکھتے نہیں
ہوتی ہے اور ایسی نظر دل کے آر پار

یادوں کے قافلوں کو لیے آ رہی ہے شام
گذریں گے رات پھر وہ مرے دل کے آر پار

یوں مسکرا کے دیکھ کہ کلیاں چٹک اُٹھیں
ایسے نہیں کہ زخم ہو ہر دل کے آر پار



☆☆☆



دیکھیں رہ سکتی ہے کس طرح تجلی روپوش
ہوش دیوانے کو آئے تو بقدرِ رمِ ہوش

راہ گم کردہ تمنا کو کہاں تک ڈھونڈوں
قلب صد چاک ہے اک ذرۂ صحرا آغوش

سرحد شام و سحر سے ہے جدا منزلِ عشق
مٹ بھی سکتی ہے کبھی غم کی خلش ہمرہِ دوش

ہائے دزدیدہ نگاہوں کی ادب آموزی
دل میں ہنگامۂ محشر سا ہے لیکن خاموش

تیرے محروم بھی سرشار ہیں بے منتِ جام
عشق ہے ساقیٔ لب تشنۂ و میخانہ بدوش

جادۂ عشق میں ہے ایک مقام ایسا بھی
دامنِ شوق میں ہو جاتی ہے منزل روپوش

کون سمجھے گا یہاں رازِ جنوں اے ہادیؔ
معنیٔ ہوش سے واقف نہیں دیوانۂ ہوش

☆☆☆

☆

پھیر کر اس نے نظر چہرے پہ ڈالا آنچل
دیکھتے دیکھتے ہی بیت گئی شامِ غزل

چہرے پر پھیل گئیں ایسے بکھر کر زلفیں
چاند کو گھیر لیں جس طرح سمٹ کر بادل

کبھی سوچا بھی نہ تھا میں نے کہ کل کیا ہوگا
کر دیا دل کو مرے آج ہی اس نے بے کل

پھر لب و کاکل و رخسار کی یاد آئی ہے
پھر فضائے دلِ محروم میں لہرائی غزل

گیسو لہرائیں تو چھا جائیں گھٹائیں کالی
طرۂ کاکلِ پیچاں ہو سمٹ کر بادل

آتا ہے اس کے چلے جانے کا رہ رہ کے خیال
روز و شب ہے دلِ مہجور میں برپا ہلچل

خواب ادھورے تھے کہ فرقت کی سحر آ پہنچی
بن نہ پایا تھا ابھی ٹوٹ گیا تاج محل

کون کہہ سکتا ہے کب ہو جسے فردا کہیے
یوں تو روزانہ ہوا کرتی ہے ہر آج کی کل

بن گئے مانع دیدار ڈھلکتے آنسو
زندگی بھر جو ترے سر سے نہ ڈھلکا آنچل

رات کے سخت اندھیرے میں بھی جی لگتا ہے
آئی ہے کیا انھیں آنکھوں سے چرا کر کاجل

آنسو لہرانے لگے آنکھ میں، دل ہے بے چین
چھائی ہے کیسی گھٹن اٹڈے ہیں ہادیؔ بادل

(۱۹۷۳ء)





نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
شکایت غمِ دل کیا کریں گے کیا معلوم

بہار آئی گلوں نے کیے گریباں چاک
یہاں بھی ہوتا ہے اپنا ہی سلسلہ معلوم

یہ دھجیاں ادب آموزِ دست وحشت ہیں
نہیں تو آپ کے دامن کا فاصلہ معلوم

اٹھی تو تھی نگہٗ شوق ان کی محفل میں
پھر اس کے بعد کسے کیا ہوا خدا معلوم

یہی تو فکر و نظر کا ہے ماحصل ہادیؔ
نہ ابتدا کی خبر نہ انتہا معلوم





جلوۂ حسن ہے نظر دشمن شوق اپنا سہی مگر دشمن

پاتا کیا عشق کی خبر دشمن نکلی اپنی ہی چشمِ تر دشمن

عشق ہی وہ مقام ہے کہ جہاں دوست قاتل ہے، چارہ گر دشمن

ہوش و مستی میں اتنا بیر نہیں جتنی ہے عقلِ خیرہ سر دشمن

ناز، انداز، عشوہ، غمزہ، ادا ایک وہ کیا، ہے گھر کا گھر دشمن

ہیں عجب دردِ عشق کے آداب آہ کھینچو مگر، اثر دشمن

مَیں کہاں آ پھنسا الٰہی خیر تھے ازل سے ہی خیر و شر دشمن

وسعتِ کائنات ہو ہم ہوں شوق کا ولولہ ہے گھر دشمن

بادلوں سے کہیں رُکی ہے کرن کیا بگاڑیں گے یہ سحر دشمن

دی شعورِ حیات کو مہمیز در حقیقت ہے دوست ہر دشمن

کیا اٹھاؤ گے ننگِ بے ہنری
ہے جو ہادیؔ جہاں ہنر دشمن

(۱۹۷۲ء)

☆☆☆
☆

زیست بے چشمِ التفات کریں — کیسے دن شب کو دن کو رات کریں

صبح یوں زندگی کی رات کریں — ان کے غم کو غمِ حیات کریں

وہ اگر چشمِ التفات کریں — نذر ہم دل کی کائنات کریں

آؤ دل سے ہی ان کی بات کریں — کچھ تو ہلکا غمِ حیات کریں

اور مشکل ہے یہ کہ ہم دل کو — محرمِ جرأت و ثبات کریں

کہہ چکا میں تو، آپ کی نظریں — یوں اشارے جو بات بات کریں

طالبِ دید اٹھا کے قیدِ نظر — جلوۂ حسنِ بے جہات کریں

زندگی خود گذشتنی ہے تو کیا — شکوۂ دردِ بے ثبات کریں

ہم ہیں اور شامِ غم کی تنہائی — کون ہے؟ کس سے دل کی بات کریں

وہ نہ دیکھیں گے کھول کر آنکھیں — کتنی ہی ہم گذارشات کریں

اشک پی پی کے مسکراتے رہیں — زندگی کے غموں کو مات کریں

تھی مشیت یہی کہ ہم ہادیؔ
اب بسر یہ غموں کی رات کریں

(۱۹۷۳ء)

☆☆☆



خوگرِ ساغرِ نظر تھا میں چشمِ ساقی میں معتبر تھا میں

مرکزِ لطف کس قدر تھا میں جیسے ہستی کا چارہ گر تھا میں

جتنا منظورِ ہر نظر تھا میں اتنا ہی خود سے بے خبر تھا میں

دور از راہ و راہبر تھا میں لاکھ خطرے ہوں بے خطر تھا میں

ان کے جلووں کی رہگذر تھا میں واقعی اتنا معتبر تھا میں

میں ہی میں یا تو، یا نہیں کچھ بھی بزم امکاں میں طرفہ تر تھا میں

زخم سے دل میں کی ہے گلکاری حسن و خوبی کا نقش گر تھا میں

سامنے آئے وہ، نہ تھا کچھ بھی ویسے کیا حرف معتبر تھا ''میں''

غم نے مجھ کو سمجھ لیا منزل عشق و مستی کی رہگذر تھا میں

''میں'' سے قطع نظر جو کی تو کھلا فتنہ پرداز خیر و شر تھا میں

متلاشی سی چشم ساقی تھی تھا تو میخانے میں، کدھر تھا میں

آرزوؤں کا تھا ہجوم ایسا اپنی خواہش سے بے خبر تھا میں

گزرے دامن جھٹک کے ''تیز قدم''(۱) ذرۂ خاک رہگذر تھا میں

چاہتے بھی تو کیا سمجھ پاتے خندہ(۲) لب اور چشم تر تھا میں

خود ہی جل بجھتا ہو جو اے ہادیؔ
وہ شرر قصہ مختصر تھا میں

(۱۹۸۳/۲/۲۵ء)

۱۔ گزرے کا فاعل

۲۔ ''خندہ لب'' اور ''چشم تر'' بغیر اضافت (ہادی القادری)




آواز شکست ساز ہے یہ اک نغمۂ بے آواز نہیں
یعنی کہ ہماری قسمت میں انجام تو کیا آغاز نہیں

ہاں تیرے لیے بھی مایوسی سرمایۂ فخر و ناز سہی
اے شمع سحر تجھ میں لیکن دل کے سے سبھی انداز نہیں

فرمائیں تکلف کیوں آخر وہ تازہ بتازہ جور کریں
ہے کون سا غم جس کی خاطر ہر وقت درِ دل باز نہیں

اس طرح نگاہیں مضطر ہیں اللہ رے جذبِ حسنِ فریب
جیسے کوئی پوچھے لیتا ہے وہ راز کہ شاید راز نہیں

دل ڈوب گیا آتے آتے ہونٹوں پہ ہی آہِ باز پسیں
کیا وجہ شکست ساز ہے وہ جو نغمہ اسیر ساز نہیں

یہ کون سی منزل کی جانب ہے آج رواں تو ذوق جنوں
بیتابیٔ قلب ویراں کیوں محتاجِ نگاہ ناز نہیں

جینے کی مصیبت باقی ہے اور زیست کبھی کی چھوڑ چکی
گویا کہ حقیقت میں ہادیؔ اب موت قدر انداز نہیں

☆☆☆

☆

حسرتیں لاکھ سہی ایک نظر دیکھو تو
ہے کرم طرز تغافل بھی مگر دیکھو تو

ہونہیں پاتی مرے دل کو خبر دیکھو تو
رکھتی ہیں آرزوئیں طرفہ ہنر دیکھو تو

اب بھی ہے سرمۂ ارباب نظر دیکھو تو
اور کیا حال ہو جو بار دگر دیکھو تو

کیسے اترا رہے ہیں برق و شرر دیکھو تو
ابھی کھل جائے بھرم ایک نظر دیکھو تو

دشت غربت کو بنا رکھا ہے گھر دیکھو تو
زیست کس شان سے ہوتی ہے بسر دیکھو تو

راکھ ہو جائے دل زار زہے اس کا نصیب
کر لیں کچھ کسب ضیا شمس و قمر دیکھو تو

جان لے قلزم موّاج حقیقت اپنی
جوش پر آئے ذرا دیدۂ تر دیکھو تو

فرض ہے دل پہ بہرحال تمنا کرنا
بات قسمت کی ہے کیا آئے نظر دیکھو تو

تہمت عشق سے ممکن ہے کشاد دل ہو
راز سربستہ کے کوچے سے گزر دیکھو تو

مسلک اہل نظر اہل نظر ہی جانیں
ہے یہی شکریۂ چشم و نظر دیکھو تو

کتنے خوش رنگ ہیں پلکوں پہ لرزتے آنسو
قلب صد چاک کی یہ سلک گہر دیکھو تو

دل کبھی رونا بھی چاہے تو ہنسی آتی ہے
ضبط غم کرنے کا ہادؔی یہ اثر دیکھو تو

(۵/۷/۱۹۸۹ء)





دل میں ہر جلوۂ صد رنگ سمو لو دیکھو — میری دنیا میں مگر آنکھ نہ کھولو دیکھو

حسن ہے، کیف ہے، مستی ہے، عجب عالم ہے — اک ذرا خواب سے بیدار تو ہو لو دیکھو

صبح پھر وعدۂ فردا سے نبٹنا ہوگا — ہجر کی شب میں تو آرام سے سو لو دیکھو

کس کو آنکھوں نے نظر سے بھی چھپا رکھا ہے — دیکھنے ہی پہ جو اصرار ہے تو لو دیکھو

غنچۂ دل مرا سو خار الم رکھتا ہے — پھول کے شوق میں کانٹے نہ چبھو لو دیکھو

ریت کی مینڈھ سے موجیں بھی کہیں رکتی ہیں — کھیل ہی کھیل میں دامن نہ بھگو لو دیکھو

رسن و دار سے آسان گذر جانے دو — عقدۂ کاکل خمدار نہ کھولو دیکھو

ابرو تنتے ہیں تو دل اور دھڑک اٹھتا ہے — ایسے نادان پہ شمشیر نہ تولو دیکھو

ناخدا عشق کا ناموس بھی لے ڈوبے گا — اپنے ہاتھوں سے ہی کشتی کو ڈبو لو دیکھو

دیکھئے ہادیؔ مرحوم یہ کون آیا ہے
منہ سے بولو نہ سہی آنکھ تو کھولو دیکھو

(۱۴/۷/۱۹۷۰ء)





گاہے ہنسنا تو گاہے نوحہ گری — آدمی، آدمی ہے جن نہ پری

ہائے اہلِ خرد کی بے خبری — پردہ ہے ادعائے پردہ دری

عالم عالم تھی ان کی جلوہ گری — ہائے کمبخت دل کی بے بصری

جانے کیا مدعیٔ خود نگری — منتہائے خبر ہے بے خبری

مدعیٔ نظر کی بے بصری — ہے نظر خود شباب جلوہ گری

زندگی سے ملاؤ آنکھ تو بات — باہمہ ادعائے دیدہ وری

جس کو بھائے ہیں درد کے انداز — کیا اٹھائے گا نازِ چارہ گری

آزمائے نہ فتنۂ دوراں — عاشق نیم جاں کی بے جگری

بے حجابانہ دید بے کم و کیف — اللہ اللہ نگاہ بے نظری

تیرے قربان ناوک دل دوز — خوب کی زخمِ دل کی بخیہ گری

جام پر جام سب کو دے ساقی — اور مینا رہے بھری کی بھری

چشمِ رحمت کو بھا گیا ہادیؔ
یہ ترا اعتراف بے ہنری

(۱۹۷۲ء)

☆☆☆

☆

ترے جلوہ سے ہوئی ہے جو نمود خوش جمالی ✽ نہ قمر میں ویسی تابش نہ شفق میں ویسی لالی

نہ وجود کوئی تجھ سا ہے نہ پیکرِ خیالی ✽ مرے بے نظیر تو خود ہے مثال بے مثالی

کوئی سمجھے کیا کہ کیوں ہے مرے چہرہ پر بحالی ✽ انھیں وہم ہے کہ شاید گیا ان کا وار خالی

انھیں سجدہ ریزیوں سے ہوئی اوج کی نمائش ✽ کہ ہے سنگ آستاں پر ہی بنائے قصر عالی

یہ طلوع مہر ہے یا کہیں آگ لگ رہی ہے ✽ ہے نمود صبح رنگیں کہ ہے میری خوش خیالی

مئے و جم کے تذکروں سے مرے کان پک گئے ہیں ✽ اے ذرا اٹھا تو دینا مرا ساغر سفالی

مجھے زندہ ہی سمجھتے جو ہے سوز و سازِ الفت ✽ کہ ہے عاشقی حقیقت، مری زندگی خیالی

غمِ عشق اور ہوس میں ہے بس اتنا فرق سمجھو ✽ کہ الٹ گیا ہے جیسے وہ عمل کہ ہے جلالی

وہ نہ دیں شراب لیکن مری سمت دیکھ تو لیں ✽ مجھے بخش دے گا مستی یہی میرا جام خالی

جو یہ نوک خار مژگاں سے ڈھلک رہے ہیں آنسو ✽ ترے ذکر میں ہے شاغل مری سبحۂ لآلی

ہے دل اک کلی اور اس میں ہیں ہزار غنچۂ و گل
ہے نصیب کس کو ہادیؔ یہ بہار لازوالی

(۱۹۷۲ء)





اس ایک سرو ناز سے جو دو بدو سی ہو گئی
یہی ہوا نا فصل گل لہو لہو سی ہو گئی

کسی کی چشمِ مست کی تسلیاں نہ پوچھیے
نظر ادھر ملی نہیں کہ گفتگو سی ہو گئی

نہ جانے کس خیال میں جو دفعتہً میں کھو گیا
ترے سوا سبھی کو ایک جستجو سی ہو گئی

سکون یاس پا چلا تھا میرا لخت لخت دل
یہ کیا کِیا کہ اس کو پھر اک آرزو سی ہو گئی

وہی جو میری آنکھ میں تھی آنسوؤں کی شکل میں
وہ حسرتِ حیات آج آبجو سی ہو گئی

نہ جانے کتنی منزلوں پہ منزلیں گزر گئیں
نگاہ جب تمام شوق و جستجو سی ہو گئی

شکستہ دل کے درد کی تجلیاں تو دیکھتے
بجھی بجھی سی زندگی بھی شمع رو سی ہو گئی

شب فراق ہادیؔ رہین اضطراب کیوں
تجلیٔ نہاں ہر ایک روبرو سی ہو گئی

☆☆☆
☆

مجھ کو بے ضبط جو تم کہتے ہو یارو تو سہی
تم مری طرح کوئی لمحہ گذارو تو سہی

دعوئ عشق مگر ترک ہوس سے پہلے
لذت آئے گی مگر غم کو نکھارو تو سہی

آدمی سے ہی ذرا دل تو لگا کر دیکھو
خود تڑپ جاؤ نہ تم عقل کے مارو، تو سہی

خود بخود ہوگی تمہیں لذت ہستی محسوس
پہلے زہر اب الم دل میں اتارو تو سہی

تو نے دل کتنے شب و روز گذارے ہنستے
اب تلافی کے لیے صبح ومسارو تو سہی

مت ستاؤ کہ نمائش کروں داغِ دل کی
ماند پڑ جاؤ نہ تم چرخ کے تارو تو سہی

میری نظروں میں بھی بے معنیٰ نہ ہو میرا وجود
چاہے کچھ کر نہ سکوں مجھ کو پکارو تو سہی

جانِ گلزار کو مٹی میں دبا آیا ہوں
تم دکھاؤ تو کوئی پھول بہارو، تو سہی

یاد تنہائی کا احساس مٹا سکتی ہے
دل کی وادی میں دبے نقش ابھارو تو سہی

لو کسی یاد کو سینے سے لگاتا ہوں میں
خشک ہو جاؤ نہ تم وقت کے دھارو، تو سہی

وقت آتا ہے لیے ساتھ میں اپنا نغمہ
شام فرقت ہے تو پھر گیت نہ گا، رو تو سہی

لب ہیں خاموش تو کیا کان تو سنتے ہوں گے
نام سے ہادیؔ مہجور پکارو تو سہی

(۱۹۷۳ء)





ہر قدم پر سوئے منزل دیکھئے
کیا جمالِ جذبِ کامل دیکھئے

کارواں در کارواں آلامِ زیست
رہ گئے ہیں وسعتِ دل دیکھئے

زندگی اک وہم بن کر رہ نہ جائے
انتظارِ موج و ساحل دیکھئے

وہ ابھی آغاز ہی آغاز ہے
عمر گزری جس کا حاصل دیکھئے

آہ اے سر گشتگانِ جشنِ گل
رنگِ خونِ دیدۂ و دل دیکھئے

اس تمنا سے عبارت ہے حیات
زندگی کو بالمقابل دیکھئے

وہ بگولے جن سے طوفاں تھرتھرائیں
موجۂ برق و سلاسل دیکھئے

ہم بڑھے جاتے ہیں ہادیؐ سوئے دوست
دم بدم مشکل سے مشکل دیکھئے

(۱۹۵۲/۱۲/۲۳ء)

☆☆☆

☆

ٹیس ہے دل میں مسلسل جیسے　　آج کے بعد نہیں کل جیسے

جذبۂ شوقِ فراواں مت پوچھ　　زیست کا جبر مسلسل جیسے

آنسوؤں نے وہ سماں باندھا ہے　　جوش پر جھرنوں کی کلکل جیسے

کون ہے جو نہ کرے شکوۂ غم　　جلتی ہے شمع مسلسل جیسے

پردۂ در کو ہوئی کیا جنبش　　سارے عالم میں ہے ہلچل جیسے

بجلی چمکاتا ہوا لکّہ ابر　　ان کا لہراتا ہو آنچل جیسے

دل دھڑکنے کی صدا یوں آئی　　آپ کے آنے کی پیچھل جیسے

یاد پیکر میں ڈھلی جاتی ہے　　آگئی آج وہی کل جیسے

یاد کے آتے ہی ہو جاتی ہے　　جذبۂ شوق پہ صیقل جیسے

ہے وہ عالم کہ ہنسی آتی ہے　　زیست کا لفظ ہے مہمل جیسے

بند آنکھیں ہوئیں نبضیں ڈوبیں　　مسئلہ ہونے کو ہے حل جیسے

کیسا ویران ہے قلبِ ہادؔی
آرزوؤں کا ہو مقتل جیسے

☆☆☆

☆

سب عشرتیں جس سے تھیں میسر، وہی جو زیرِ مزار سوئے
نہ دل کا سویا نصیب جاگے، نہ دیدۂ اشک بار سوئے
بلا سے سوتا ہے گر زمانہ میانِ شبہائے تار سوئے
جب آنکھ میں انتظار جاگے تو کیا دل بے قرار سوئے
یہ ہار کوئی گلے سے اپنے اتار کر اس نے رکھ دیا ہے
کہ میری آنکھوں سے جو گرے ہیں ان آنسوؤں کی قطار سوئے
وہ مست آنکھیں مندی مندی سی وہ رنگِ عارض اڑا اڑا سا
سبھی نے دیکھے ہیں نرگس و گل ہمیں نے دیکھی بہار سوئے
جھلک نظر آئی پر نہ پایا تو پھر تمنائے دید جاگی
جو سوئے ہم جاگ جاگ اٹھے، اٹھے تو ہم بار بار سوئے
جو ہیں اسیرِ سرورِ عشرت وہ جانیں کیا زندگی کی لذت
کبھی نہ بر اوجِ دار جاگے کبھی نہ بر نوک خار سوئے
جکڑ گئے ایسے جانے والے کہ تصفیہ ہو گیا ہے مشکل
مثالِ شمعِ مزار جاگے کہ یہ دلِ بے قرار سوئے
نظر جو پڑ جاتی اس کے رخ پر تو ہمتیں دل کی جاگ اٹھتیں
ترس گئیں خواب تک کو آنکھیں، جدائی میں ہم ہزار سوئے
وہ جس سے کتنے لطیف نغمے بکھیرے تھے دستِ زخمہ زن نے
وہی ہے سازِ دل شکستہ پڑے ہیں سب جس کے تار سوئے
ٹپکتے دیکھے ہیں فصل گل میں بھی اس کی آنکھوں سے اشکِ شبنم
خزاں کی آفت مَیں جھیل لوں گا خوشی سے جانِ بہار سوئے
سروں پہ سورج چمک رہا ہے پڑا ہے دنیا کا کارخانہ
دلِ حزیں کو سنبھالو اٹھو بہت بہ آغوشِ یار سوئے

کچھ اس طرح اشکِ خونِ دل سے ہوئے ہیں گلنار جیب و دامن
کہ جیسے سینے پہ رکھ کے ہادؔی کے سر کوئی گل عذار سوئے
(۱۹۷۳ء)



یوں خونِ دل نثار کیا اشک بار نے — رنگ چمن دکھا دیا دامن کے تار نے
کچھ ایسا طول کھینچا شب انتظار نے — مشکل ہوئے حیات کے لمحے گزارنے
دے دی شکست تاروں کو شبہائے تار نے — میداں سنبھال رکھا دلِ داغدار نے
کیا کھیل کھیلا زندگیٔ مستعار نے — چھا کر دکھایا دہر پہ مشت غبار نے
یہ دن دکھائے بے رُخیٔ چشم یار نے — میں لگ گیا ہوں ہجر کی زلفیں سنوارنے
دیتا ہے کون ساتھ کسی بدنصیب کا — بہلایا تھوڑی دیر شب انتظار نے
پھولوں کے بس میں کب ہے خزاں کا مقابلہ — کچھ روز اپنا رنگ جمایا بہار نے
وحشت کا جھیلنا نہ تھی دامن کے بس کی بات — حقِ جنوں ادا کیا ہر ایک تار نے
آنکھوں سے دور ہونے پہ ملنا کہاں نصیب — چھوڑا نہ ساتھ درد کا آنسو کے تار نے
سینے میں بند رکھے ہیں جو داغہائے دل — بڑھتا ہے کون دیکھیں اب ان کو شمار نے
دیکھیں کہ کون رکھے گا اب لاج عشق کی — آئے تھے ایک ہم ہی یہاں دل کو ہارنے

☆ حضرت اقدس نے بتایا تھا بدایوں کی مٹی علم وفن کے لیے مردم خیز تھی پھر ایک بے پڑھے لکھے شاعر کا مطلع سنایا۔
خلعت برہنگی کا جو بخشا بہار نے — دستِ جنوں لگا مرے کپڑے اتارنے
نہ جانے کیسے یہ مطلع یاد آ گیا اور قلم چل پڑا۔ (ہادی القادری)

ہادیؔ بڑھا ہے شوق اسی آن بان سے
چاہا قدم کو روکنا ہر ایک خار نے

☆☆☆

☆

رہتے تھے ہنستے بولتے کیسے، ابھی کی بات ہے
اس نے نگاہ پھیر لی، اس کی خوشی کی بات ہے
ہے تو ہر ایک شے وہی لگتی ہے کچھ عجیب سی
یہ کوئی دل لگی نہیں، دل کی لگی کی بات ہے
جب تری احتیاج تھی اور فزوں نفس نفس
تیری جدائی اس گھڑی کیسی کمی کی بات ہے
اپنے دلوں میں دوسرے پائیں نہ دیکھنے کی تاب
جینا اور اس طرح بڑی بے جگری کی بات ہے
شوق کی ناتمامیاں، درد کی بے قراریاں
کون کہے گا جس طرح اور کسی کی بات ہے
غم بھی کوئی نوشتہ ہے بھیگ کے مٹ ہی جائے گا
کہتے ہیں خوب رولوں میں کتنی ہنسی کی بات ہے
ایسے بڑے ہوئے، ملے، ساتھ رہے، بچھڑ گئے
جیسے کہ سرگزشتِ عمر چار گھڑی کی بات ہے
صبح ہوئی تو چھا گیا غم کا اندھیرا ہر طرف
سب یہ مرے نصیب کی تیرہ شبی کی بات ہے
تھا یہ نصیب کا لکھا مجھ پہ کھلے نفس نفس
بے ترے زیست کس قدر دردسری کی بات ہے
رند کی بے نیازیاں فکرِ جہاں میں کھو گئیں
کس سے کہوں کہ لو سنو ایک ہنسی کی بات ہے
غم کے ہجوم میں کہاں پائے گا لذتِ حیات

جو یہ کہے کہ عاشقی بے ضرری کی بات ہے
ہادیؔ زار و مضطرب پاؤگے وہ نظر کہاں
اور یہ دل کے زخم کی بخیہ گری کی بات ہے

(۱۲/۱۲/۱۹۷۲ء)



سارے جہاں سے بے نیاز نرگس نیم باز ہے — رخ پہ سکوں کی ہے جھلک آمدِ خوابِ ناز ہے

شام ہو اب کہ ہو سحر غم ترا بے نیاز ہے — تیرے بغیر زندگی ایک شبِ دراز ہے

دیدتھی آنکھ کا سرور یاد سے دل کی دھڑکنیں — اے مری باصرہ نواز غم ترا دلنواز ہے

زیست ہے کرب موت کا، موت سکوں کی زندگی — تیرے دمکتے چہرے نے فاش کیا یہ راز ہے

باعثِ رنج و درد تھی آرزوؤں کی کشمکش — جو بھی نگاہ پھیر لے فکر سے بے نیاز ہے

کوئی کرے تو کیا کرے اس لیے صبر وشکر بس — مہلتِ زیست مختصر، کار جہاں دراز ہے

حاصلِ غم ہے صرف غم، کارعبث ہے فکر کیوں — بگڑی بنا ہی دے گا جو مالک کارساز ہے

اب یہ کھلا حقیقتاً اصل ہے عشق معتبر — رنجِ فراق وشوق وصل، کچھ بھی نہیں، مجاز ہے

میں جو تڑپ کے روؤں تو دے نہ سکے تسلیاں — بس یہ حیات وموت میں مابہ الامتیاز ہے

آنکھ میں میری تو کبھی دیکھ نہ سکتی تھی نمی — دیکھ کہ تیری یاد ہی آج جگر گداز ہے

زخمۂ غم کی ضرب سے ٹوٹے ربابِ دل کے تار — نغمۂ نا تمام اب اور شکستہ ساز ہے

مانگ لے اور مانگ کر ہادیؔ مضطرب کو دے

بارش لطف عام ہے باب قبول باز ہے

(۱/۱۲/۲۱۹۷ء)

☆☆☆

متفرقات

☆

جھوم اٹھا وجود روضۃ الجنۃ میں | پڑھتا ہوں درود روضۃ الجنۃ میں
ہے نقش تصور میں کوئی نقش قدم | ہوں سر بسجود روضۃ الجنۃ میں

☆

میں کہ اک رند لا ابالی ہوں | خادم بندگان عالی ہوں
کہتے ہیں سب گدائے خاک نشیں | میں کہ فرد صف نعالی ہوں

☆

بہت ہی گرم محشر میں خبر ہے ان کے آنے کی | ذرا جلدی سے کڑیاں جوڑلوں اپنے فسانے کی
کہانی تو کسی صورت نہ تھی سننے سنانے کی | مگر رحمت جو سرخی بن گئی میرے فسانے کی
دل خوں گشتہ آنکھوں سے رواں ہو جاتا ہے ہادؔی | ادا جب یاد آتی ہے کسی کے مسکرانے کی

☆

مظہر شمع خیابانِ ازل | نور ہی نور تھی ساری صورت
خُلق قرآں کی مکمل تصویر | آیۂ رحمت باری صورت
برق وش سیر نے معراج کی شب | ماہ و انجم کی اتاری صورت
بولے صدیق کہ یہ سچے ہیں | کرتی ہے آئینہ داری صورت

☆ یہ نعت اور غزل کے وہ متفرق اشعار ہیں جو میں نے اپنے گھر میں سنے یا ٹیپ ریکارڈ میں خود حضرت ہادؔی کی زبانی سنے اور حافظے کے کسی گوشے میں محفوظ رہ گئے۔ (اسید الحق)



کہو کیا فرق معراجِ کلیم و مصطفیٰ میں ہے
یہی سمجھو جو کوہِ طور و عرش کبریا میں ہے
انوکھی قرب کی یہ شان محبوبِ خدا میں ہے
کہ جن کا رتبۂ علیا ہمیشہ ارتقا میں ہے
جو کیفیت جمالِ حضرت خیرالوریٰ میں ہے
جھلک اس کی ادھوری آئنۂ قبلہ نما میں ہے



وسعتِ رحمتِ تمام تا حدِ کائنات ہے
آئینہ صفات میں پرتوِ حسن ذات ہے
جب مری چشم اشکبار لے گئی موتیوں کا ہار
حکم ہوا گناہگار تیرے لیے نجات ہے
تیرے سوا کسے ملا ختمِ رسل یہ مرتبہ
وحیِ جناب کبریا تیری ہر ایک بات ہے
عفوِ گناہ اور پھر ایک گناہ گار کا
ہادیؔ مضطرب انھیں بات میں کوئی بات ہے



زندگی جب غم و آلام میں گھر جائے ہے
موت بھی سامنے آتے ہوئے شرمائے ہے
فکرِ فردا سے گراں بار سیہ رات میں بھی
رنج امروز تری یاد میں کھو جائے ہے



دل وہی درد وہی درد کی لذت ہے وہی
میں کہیں جاؤں ترے عشق سے نسبت ہے وہی
اب کہ دنیا کو نہیں کوئی ضرورت میری
اس طرف دیکھ مجھے تیری ضرورت ہے وہی



ان کی گھنگور گھنی زلفوں میں
زندگی راہ بھٹک جاتی ہے
پھول جب روند دیئے جاتے ہیں
دور تک ان کی مہک جاتی ہے
غمِ فردا کے وہ تیور توبہ
مئے امروز چھلک جاتی ہے



ذرا تو رسمِ زمانہ نباہ تھوڑی سی
نگاہ ملتی رہے گاہ گاہ تھوڑی سی
سحر کے ساتھ کہیں وہ بھی ساتھ چھوڑ نہ جائے
وہ ایک آس کہ ہے دل میں آہ تھوڑی سی
ذرا سی دیر تو ہمت نہ ہار اے راہی
وہ دیکھ سامنے باقی ہے راہ تھوڑی سی

مقالات الاموى

شاعر الشرق

لايمكن لرجل حر مهذب ان لا يعرف محمد اقبال ولا يعترف بفضله ومقامه الرفيع فى الشعر والحكمة فانه شمس الشرق انارت الشبان.

ولد هذا الشاعر العبقرى فى "سيالكوٹ" سنة ١٨٧٥م فى عشيرة حديثة الاسلام كانوا اجدداده من البراهمة كهنة الهنادک اصلهم من اعالى کشمير، اسلموا ونزلوا الى بنجاب توطنوا هناک وحسن اسلامهم ورزقوا خيرا کثيرا افضلها رزقهم بولد کريم صار سببا لبقاء ذکرهم طول الدهر.

نشأهذا الطفل فى داره ورباه ابواه احسن تربية فکان حسن السريرة والفطنة والذکاء فى صغره مولعا بالصلوٰة وتلاوة کلام اللّٰه تعالٰى. فلما ترعرع اخذ يتعلم الفارسية والعربية فى داره ثم ارسله ابوه الى مدرسة هناک. فنال شهادة الدراسة الثانوية ثم ذهب الى "لاهور" لينال الدراسة الجامعية. فتعلم و تخرج وعين مدرساً بالکلية يُدرّس الفلسفة وادبى الا نکليزى والعربى وبعد سنين عديدة ارسله اخوه الا کبر الى انجلترا فتعلم هناک وفاز بشهادتين عاليتين احديهما الدکتورات فى الفلسفة (.Ph.D) واخرى المحاماة فى القانون (Bor at Law) وتعلق بجامعة لندرا فکان استاذ العربية بتلک الجامعة.

ولما رجع الى الهند جعل مدينة لاهور مستقره واشتغل بالمحاماة طول عمره ولکنه ماکان اهلا لذلک مع بصيرته فى القانون. لانه کان شاعراً فيلسوفا والشعراء لا يهتمون باموتهتمها العامة من الرجال. فکان اکبرهمه

ايقاظ الشباب وانقاذ الوطن من ايدى الا جانب الانكليز الظالمين.

وكان فى بدء امره وطنيا يفضل العاطفة الوطنية على كل العواطف حتى كانه كان يدين بوطنيته. كماتشيراليه اشعاره الا سيما نظمه الذى سماه "نيا شواله" اى "المعبد الجديد" فصرح فيه انه يحب ذرات رمال وطنه كحبهم آلهتهم. ففى شعره بذلک العصر حرارة لا يستهان بها ولكنها ليست اقصى ما يرام.

فلما نزل بانكلترا و سارفى البلاد الاوربية شاهد الحرية الوطنية عن قرب و احس ان لها منافع ومضارو ضررها اكثر من نفعها. فان من يتقلد بالوطنية يجب عليه ان يضحى بكل شى فى مصلحة الوطن وارتقائه. فهذا محمود لا ينكر ولكن الوطنى لا يكون وطنيا اذا لا يكون مرماه تخضيع الرجال الذين ليسوا بنى وطنه. لذلک يستمر الجدال والقتال بين بنى آدم اذا هم تقلدوا بالوطنية المحضة فهذا هوالوجدان الذى ايقظه واعطاه البصيرة واحس بشعور جديد.

فلما رجع هذا الوطنى الى وطنه العزيز فكان يتصور انه انسان قبل الهندى وان وطنه ليس سيالكورت او لاهور او بنجاب او الهند باجمعها بل الارض بكرتها كلها وطنه. فانشد يقول

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا　　مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

الصين والعرب والهند كلها لنا　　نحن المسلمون كل الارض وطن لنا

لانه كان يعلن باسلامه وينادى الشبان ويقودهم الى الحرية الاسلامية لا الوطنية وكانو يسبونه ويغلظون القول ولكنه ما انقاد لهم بعد مافک عن رقبته اسر القلادة الوطنية.

لقد يعلمون الذين تفرسوا وتفقهوا فى شعره انه ماكان قهقريا ولا ينكر حب الوطن وانه ليس بمتعصب قط. بل انه حر بمعنى الكلمة ويعتقد ان فى العيش نصيب لكل بنى آدم اسودها واحمرها، اعرابها واعاجمها. ويعلم ان الامن

العالمی والحریة الكاملة للانسانية باجمعها لا یمکن تصورها الا فی ظل الاسلام. فجعل المسلم المثل الاعلی للحریة والامن العالمی لان المسلم هو الرجل الذی له ید و لسان لا توذی رجلاً آخر.

واذا فهمنا ان الشاعر لا یستعمل الا لفاظ فی المعانی اللغویة بل عنده لكل لفظ معنی خاص یرید به. فیسهل ادراک المفهوم علی الطالب.

ولهذا الشاعر مصطلحات یذكرها فی شعره مرة بعد اخری فلنذكر شیئاً منها "مرد مومن" ای "الرجل المؤمن" ففی الظاهر یراد به كل من تقلد بالاسلام و آمن باللّٰه ورسوله ولكن الشاعر یستعیر به المثل الاعلیٰ للانسانیة لان الذی یسلم حقیقة لایخضع امام ای شی و ینكر السلطة الا سلطان اللّٰه الرحمٰن الرحیم، فلا یعید الا الی الحق فی كل الامور الدنیویة اوالدینیة لذلک یخاطب الشباب "بمرد مومن" ای الرجل الصادق الامین الكامل والمثل الاعلیٰ للانسانیة.

"عشق" فان لهذا اللفظ ایضا مفهوم خاص فی اصطلاح الشاعر وهو عبارة عن تجاوز ایشوق الحدود لا فی الهوی النفسانیة بل فی كل الامور حتی لا یقعد العاشق فوز ولا یطفاء نار آماله ببرودة العیش فی ای منزل ولو كان اسمی مما یرام. ولا یفزع ولا یبالی بالا خطار.

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

ولج العشق ناراً اناره نمرود وما فزع

"خودی" "حسن الظن بذاته" فالشعراء والمتصوفون یتصورون ان من یحب یجب علیه ان یفنی بذاته ولا یشعر الا بما هو من عند حبیبه ویستحسنون "بیخودی" ای "نفی الذات" ویذمون "خودی" ای "حسن الظن بذاته" ولكن هذا الشاعراستحسن "خودی" فی شعره وامرالشبان ان یحتفظوا "خودی" فهذا

خلاف لما امرنا القدماء به. فوجب علينا ان ننعم النظر فی مفهوم اللفظ فوجدنا ان الشاعر لا یقصد به حسن الظن بالذات بل یریدبه عرفان النفس لان عرفان النفس ضروری لمن یرید النجاح فی ای امر. فمن لا یعرف نفسه ولا یعتمد علیه لا یتقدم نحوالامام ولو خطوة. ویشیر إلٰی هذا المعنی من عرف نفسه فقد عرف ربه. لان الانسان خلیفة اللّٰه فی الارض فاذا تدبر فی نفسه یخطو الی الامام وینقاد له الایام ویصدق علیه "وللاخرة خیر لک من الاولٰی".

انشد هذا الشاعر الحکیم والفیلسوف الکریم بلسانین. الاردویة والفارسیة وله دواوین شعر عذب حارفی اللغتین.

فاربع مجلدات منها فی الاردویة– اولها "بانک درا" ای "نداء الرحیل" ثانیها "بال جبریل" ای ریشة جبریل، ثالثها "ضرب کلیم" ورابعها "ارمغان حجاز" ای "الهدیة الحجازیة" وهذا المجلد الاخیر یتضمن قسمین: قسم فی الاردویة وقسم فی الفارسیة.

وفی الفارسیة ١۔اسرارخودی ورموز بیخودی،٢۔ پیام مشرق،٣۔زبورعجم،٤۔جاویدنامه، ٥۔مسافروپس چه باید کرا اقوام مشرق۔

وماعدا هذه المجلدات له مقالات و محاضرات فی اللغة الانکلیزیة تفسر بما عنده من الحکمة البالغة.

عاش هذا الشاعر ثلث و ستون سنة وانتقل الی رحمة ربه فی سنة ١٩٣٨م و دفن فی لاهور بخارج الجامع السلطانی یغفراللّٰه له ونور مرقده ویسکنه فسیح جنته.



آخر ملوک الهند

ولد هذا المسكين فی قصر ملكی عامر المشهور "بلال قلعه" ای "الحصن الاحمر" سنة ١٧٧٥ م وسمی بسراج الدين ونشأ فی الحصن وتعلم و تادب حتی نبغ فی العلوم والاداب و تمرن الفنون الحربية ومهر فيه كعادة ابناء الملوک فی عصره.

كان لسراج الدين اسمی مقام فی العلم حتی يقال انه ماولد فی البيت الملكی اعلم منه بعد جدجده محی الدين الشهير "باورنگ زيب" الملقب "بعالم كير" رحمه الله. وكان عالما خبيرا وقادا حسن السريرة عالی الهمة ولكن الاقدار لم تسمح له ان يستفيد من علمه ومهارته ويخدم الدولة والوطن. لان اباه الملک مازال حيا و ما اتاه العرش الابعد ان شب شعره ضعفت قواه و غارت همته.

ماكانت الدولة المغلية فی آخرايا مها الاعبارة عن عرش و حصن وراتب شهرية من شركة شرق الهند (E.I.Co.) والاقتدار والسلطان حتی حوالی العاصمة دهلی كان للشركة نفسها فكانت هی الآمرة الناهية فی الحقيقة.

فما كان يقدر صاحب الجلالة ملک الهند ان يتخذًا حدا من ابناء ٖه ويجعله ولی عهده الا بعد ماجازته الشركة الخبيثة فيعين جلالة ظل الله الملک باشاراتها.

فلما تمكن سراج الدين علی العرش و لقب ب بهادرشاه ای الملک الشجاع ماكان يستطيع ان ينجلی عنه وعن الوطن فما كان عنده جيش ولا

مال ولا شباب فاستغنى باسمه عن عزائمه وجلس على عرش المملكة كأنه ناسک فقير معتكف فى كهفه على راسه طاقية وبيده سبحة بدلا عن التاج والسيف.

كان هذا الملک العالم مولعاً بالشعر فكان يقضى ايامه بالانشاد و الغناء. فجمع فى قصره الشعراء بدلا عن الابطال والعسكريين فكانوا يمدحونه و ينشدون القصائد ويرجعون بالجوائز. والملک ايضا ينشد الاشعار اكثرها فى الغزل (و هٰذا نوع من أنواع الشعر الرائق) والتصوف.

وكان هٰذا الملک الملقب ببهادر شاه ياتى فى شعره باسم صغير كعادة الشعراء (يصطلحون هذا الاسم الصغير بتخلص) هو "ظفر" ولا له الا الياس والخيبة، فيا عجبا بتخليصه ظفراً. هنالک اتذكرقول ابى الطيب فى زنجى ليلٰى اللون يسمى كافوراً. فما اطيب ماقال "وبضدها تتبين الاشياء".

فلما ثارت الهند باجمعها ضد الانكليز سنة ١٨٥٧م كان هذا المسكين فى حصنه مضطربا قلقاً الايدرى ماذا يفعل هل يخرج الى الساحة ويقود الشعب ليعطى الوطن حريته او يموت فى سبيله ام يقعد ينتظر قضاء اللّٰه. حتى قامت الثورة واجتمع الاحرار امام الباب العالى فثار ثائره وامر قواده ان يقودوا الاحرار و يقاتلو الفرنجيين الفجرة.

ولكن الفوز ماتيسر للاحرار لاسباب منها: غدر المقربين وانشقاق القائدين وعدم نظم العسكريين فهزم الجمع وولوا الدبر فدخل القصر وحضر بين يدى الملک صهره واكبر وزرائه وحضه على رفض الاحرار بقاءً لحياته وصوناً لعرشه كما هو. فاستسلم الامر إليه.

خرج الملک المسكين مع عشيرته من الحصن الاحمر لما اشار اليه صهره و نزل خارج المدينة بمقبرة جده همايون ودخلت العساكر الا نكليزية

عاصمة الهند فقتلوا الاهالى ونهبوا اموالهم وخربوا العمران وحاصروا المقبرة التى نزل فيها الملک وابنائه وعشيرته.

فلما استولت القوات الاجنبية المشؤمه على العاصمة واخذوا يقتلون و ينهبون و يذبحون اطفالا صغاراً حضر قائد الجيش الوطنى بخت خان فى المقبرة بين يدى الملک واخبره بما يفعله الا نكليز الخائنون وقال انهم الغادرون فيجب علينا ان نرحل الى الجبال ونتخذها ماوى لنا وبعد ما نتمكن نكر الى القتال ونفوز ان شاء اللّٰه تعالىٰ. فان العاصمة ليست بمملكة فان هزمنا عنها لا يلزم ان نترک القتال ونستسلم نفوسنا بايدى الظالمين اعدائنا اعداء الوطن والحرية. فهيابنا فقد تجتمع الامة حول ملكها حين ايقنت بنجاحه.

فنظر الملک المسكين الى اقرب المقربين واستشاره فاوعده بالهلاک اذا فر مع القائد الحر الباسل وذكر وعود الا نكليز بان عرشه سيعود اليه وراتب لا ينقطع وانه سيعيش عيشة راضية.

فرفض الملک اقتراح القائد بخت خان وامتنع عن الفرار معه وقال رضيت بالقضاء فانج انت بنفسک فاذا نجحت آمالک كنت معک. فقال بخت خان اذا انت لا تذهب معى فارسل معى ابناءک وولى عهدک لتجتمع الامة حولهم فرفض هذا الاقتراح ايضا. فبكى بخت خان وانصرف الى جهة لا يعلمها الا اللّٰه.

وبعد ما ايقن الا نكليز بهزيمة الا حرارالوطنيين دخل المقبرة قائد الجيش مع الجنديين وقبض على الملک وابنائه وعشيرته وساقوهم مسجونين فندم على البقاء ورفض اقتراح القائد الوفى المخلص ولكن لم تنفع له الندامة.

والملاعنة ذبحوا الامراء الشبان وقطعوا رؤوسهم واتوا بها الى المسكين فى طسوت مغطاة كأنه الطعام. فلما كشف الغطاء وراى افلا ذ كبده ابتسم وقال هكذا يموتون الا مراء المغلون.

ساقوه الى محكمة خاصة للحكم عليه. واثبتوا انه غدار اكبر وما كانت ثورة الاحـرار الا بـاشـارته وطوعا لا وامره واستشهدوا على قولهم بفراره من الحصن بـعـد هزيمة الا حرار مع انه كان هذا الامر باشارتهم وكانوا وعدوه انهم يعيدونه فـي الـحصن واخيرا حكم عليه بالحبس طول حياته وانجلائه من الهند فذهبوا به اسيـراً الـى بـرمـا وسـجنوه هناك فى سجن خصوصى انتقل منه الى رحمته اللّٰه تعالٰى سنة ١٨٦٢م.

ومـن آثـاره رحـمه اللّٰه "كوشک محل" فى الحصن الاحمر على حصاره الشرقى كان يجلس فيه يشاهد منظر النهر "جمنا" وله اثرحى وهو ديوان شعر رائق عذب لا يبلى ولا يمزقه مرور الايام لان فيه روح وجدانه.



شاعر النار والدمار

بـلاد الهـنـد تسـمـى شبـه الـقارة وهى وسيعة جداً تمتازو لاياتها بالطبيعة المختلفة. ففيها جبال شاهقة و ميادين واسعة وانها رجارية ورماد متراكمة.

ولـكـن كل هذا الاختلاف الطبيعى لا يعادل حقيقة باختلاف السن اهاليها القاطنين فى انحاء البلاد.

لا يـمـكن لاحد ان يسير فى البلاد الهندية ولا يدهش من مناظرها الطبيعية ولا يتـعـجـب عـلـى اوضـاع الهـنـود والسـنهم المختلفة فانه اذا مادخل ولاية يـحسـب انـه نـازل ببلاد اجنبية فاذا كانت الولاية التى مربها هى الهند فما هى التى دخلها؟ فيشوش ادراكه ويسأل عن نفسه اين الهند وكلها هند باجمعها.

الـلـغـات الهـنـدية عديدة يستعملها العامة. ينطقون بها وينشدون الاشعار فيهـا. ولكن اغنى اللغات الهندية واحلٰها ادبا منها لغتين "البنغالية والاردوية". تمتاز ادبهما بالأنواع والاساليب الادبية.

فـالاردوية لسـان مخلوط جديد ليس لها منطقة مخصوصة كسائر اللغات الهـنـدية. يستـعلمها الاهالى فى كل مقاطع الهندية. والبنغالية يستعملها الذين يسـكـنون فى "بنغالة" وهى ولاية فى شرق الهند، كثيرة المياه والغابات، ذات مـناظر جميلة وهواء غليل. اهاليها مشغوفون بالغناء والرقص واكثرهم الفقراء والمساكين.

فـادب البنغالية يمتاز باداب اللغات الهندية بعذوبته. لما فيه روح مناظر البنغالة

ووجدان ان اهاليها المساكين. فانهم يرقصون ويغنون وحياتهم كلها التعب والمصائب. وكأنهم يعتقدون بالعيش الروحانى. وينشدون بالحب والعزم بدلا عن العويل والبكاء ولوجدانهم هٰذا يد بيضاء لشعرائهم المتصوفين الذين يحرضون على الحياة الروحانية ويمثلون الحب فوق كل شئ حتى العمل للعيش والفوز فى حياتهم العملية.

ولد فى هذه المنطقة (بنغاله) طفل فى عائلة مسلمة فقيرة خاملة الذكر. فما تيسر له ان يتعلم ويترقى المدارج العلمية. فقرأ القرآن وشيأ يسيراً من الفارسية وتمرن الالحان الموسيقية كعادة البنغالين المشغوفين بالرقص والغناء. ولكن الاقدار ما سمحته ان يمهر فى العلوم او ينبغ فى الموسيقى لان اباه كان فلاحاً بالسا يشتغل اجيراً باراضى ذوى العقارات. فاشتغل الابن المسكين بالفلاحة مع ابيه.

ولما كان هذ الولد المسكين "نذر الاسلام" ابن ثمانية عشر اذ نشبت نار الحرب العالمية الاولىٰ. فتعلق بالجيش جنديا تقلد السيف وانتقل مع جيشهٖ من الحقول الخضرة الى ساحات القتال ورموه الانكليز فى العراق حيث كان معسكرهم.

ذات ليلة دق جرس الخطر. فهرب الجميع الى خنادق. وهجمت طيارات الاتحاديين وقذفت القنابل. فقامت القيامة فى الجند البريطانى. فما كان احد يا من على نفسه حتى فى الخنادق العميقة المظلمة. فكانوا بين قتلى وجريح، والفضاء كلها صراخ وعويل، ولكنه كان بينهم جندى لا يبالى بالخطر المحدق وكان فى يده قرطاس وقلم الرصاف يرقص عليه والظلا مخيم. وما كان يشعر هٰذالجندى بما هو كاتب فلما اصبح دهش حين راى القرطاس مكتوبا فيه قطعة اشعار حماسية بديعة. فما كان يصدق نفسه لانه مانشد الا شعار قط وما كان شاعراً من قبل.

هٰكذٰ كان بدء الامر فصار الجندى المسكين الغريب شاعراً عبقريا فلما رجع الى ام راسه بعد الهدنة فكان عليه لباس الجندى الرسمى وفى جيبه قراطيس مكتوبة فيها اشعار حماسية ما سمعتها الأذان مثلها فى البنعالية قط. فشعره يختلف باشعار شعراء البنعالية تماماً وله اسلوب غير الاساليب المعتارة و روح جديد يسرى فى معانيه.

نشرت الجرائد شعره الحار. ثم الفت منه صحيفة صغيرة سماها الشاعر "اكنى وينا" (اى النفير النارى) وكان فيها شعره الذى انشده فى ارض العراق الحامية وهو جندى فى المعسكر البريطانى يرجوبه نهوض المسلمين و فوزهم وهزيمة الطاغين. فاغتاض الحكومة وحدوده الحاكمون وامر و اباصراق النفير النارى وحرم الشاعر من راتبهٖ فكان الشاعر فى ضيق شديد ثابتا فى جاشه لانه كان عالما بهٰذا الجراء من قبل الحكومة الطاغية الملعونه.

ماكان يخطر بباله هجوم الادباء والشعراء عليه والشاعر الفيلسوف "تيغور" يرأسهم. ولكن شعره النارى وموسيقيته الحاراخذ يتزعزع قصر الادب البنغالى لانه يوقض البائسين النائمين ويوقد نار الحياة فى قلوبهم. وكانوا يعتقدون بحياة روحانية وينشدون الاغاريد الغرامية بالحان مسكرة فقاموا باجمعهم ورموه بالبدعة الادبية.

قامت الحرب الادبية بين هٰولاء وبين شاعر النار والد مار فكان قلقا ولكن الاديب والزعيم الشهير البطل "جترنجن داس" نصره وكان ينشر اشعاره فى جريدته "المقدام" لولاه لما فاز الشاعر عليهم اجمعين.

ولما ذاع شعره وقرأوه الاهالى استحسنوه لانهم وجدوا فيه وجدان الحقيقة الشابة وروحا حماسيا يرشدهم الى الامام ويمثل لهم الحياة كما هى. ويدعوهم الى الثورة ضد الظالمين الذين يعيشون عيشة راضية بغير عمل ما والذين

يجهدون لا تاتيهم الا كسيرات من رغيف يابس لا يالفها كلاب الخائنين .

انشـد هـذا الشـاعـر ابيـاتا وسماها "دروهى" (اى الثائر) فتعلقت الابيات بـقـلـوب الاهـالـى فلقبوه "دروهى كوى" (اى شاعرالثورة) واعجب بها كبار العلماء والادباء فى عصره. فكتب الاستاذ "سركار" ما معناه:

"لـمـا قرأت هذه الابيات (دروهى) شعرت بان الثورة التى كنا ننتظرها منذ اعوام طوال قد لاحت بشائرها وان سيلا من شعور الحياة يهيج فى ادبنا. كنا نحسب ان الـمسـلـميـن البنغالين ما التفتوا الى لسانهم الوطنى التفاتاً تاما. ولكن ايقظ الروح الوطنى قد بدأ بايديهم ولهم الفضل ثابت فى هذا الامر".

ولهـذا الشاعر فضل آخر ليس لاحد سواه وهو انه الشاعر البنغالى الوحيد سجنهُ الا نكليز مراراً جزاءً لحريته وامتنعوا الناس عن شعره واتلفوا عدة مجلدات منه.

كـان هـذا الشـاعر فى بدء الامر يخاطب شباب المسلمين ويحضهم على النهوض وقيامهم امام الظالمين واستيصالهم وانقاذ الوطن من ايدى الخائنين. ولـكـنـه بـعد زمن قليل احس ان المظلومين ليسوا ابناء دينه فقط فتخصيصهم بـالـخـطـاب لا يـفيـد لان الـظـلـم لا يفنى ولو امن المسلمون منه. فكان ينادى الشبان المظلومين ايما كانوا واينما وجدوا.

فهذا الشاعريستحق ان يرى فضله ويستعظمه الجميع.

وبشعر هذا الشاعر صارالادب البنغالية يمثل الهند باجمعها لانه هوالادب الـجـامـع بيـن الـجـمـال والـجـلال المتباينين كجبال الهند الشاهقه وميادينها الواسعة وانهارها الجارية ورمادها المتراكمة.



البطش والرّحمه

يفتخرون الملوک علی سلطانهم ویظلمون الناس ویختلسون اموالهم و انفسهم کیف ماشاؤا ولایقدر احدٌ علی ان یتاوه جهاراً خوفاً منهم. ولکن شهدت الهند ملوکا مسلمین الصفوا ورحموا علی الضعفاء والمساکین وهم الذین عمرو البلاد واسسوا الدولة حقیقة.

انی احدثکم عن ملک ذی باس شدید، کان یخفق بین جنبه قلب حنون رحیم. وهو الملک الشجاع المقدام مؤسس الدولة المغلیة فی الهند الغنیة صاحب الجلالة الملک بابر المغفورله–لا ینکر لسالته ویقسم بحدة سیفه الشجعان لکنه مع بطشه کان رحیما بمعنی الکلمة.

ما هذا قولی فقط بل سجله التاریخ باحرف من نور

کانت دهلی عاصمة الهند من اقدم الزمان وکانت مدینةٌ عامرةٌ مثل سائر المدن العامرة الغنیة. فاسواقها مملوء ة وشوارعها مزدحمة من المارین. رجالا ونساءً شیوخاً وشبانا وصبیانا واطفالا. اذعلا الغوغاء واضطرب الجمیع واخذوا یهربون الٰی حیثما توجهوا خوفا من الموت لا یفوتهم اذا دسهم فیل عاصی مجنون.

الناس کانوا یمرون والفیل بعد وغضبانا– یاخذ هذا بخرطومه ویدس ذلک برجله والفضاء کلها صیاح وعوید. وکانت فی السوق امرأة منبوذة تحمل فوق راسها سلة فیها طفل صغیر. اذ دنی الفیل من تلک الامرأة المنبوذة فقفزت المرأة

وهـربـت لا تدرى الانفسها. والطفل قد هوى من السلة والفيل تقدم نحو الطفل الـصغير. والجمع ينظرون متأسفين منتظرين قضاء اللّٰه. اذهرع رجل نحو الطفل والتـقـطـه وانقذه فغضب الفيل على هذا الرجل ومد اليه خرطومه الطويل ليقبض عليه ويسقيه مرارة غيضه جزاءً على رحمته على الطفل الصغير المسكين.

والـرجـل قـد فرمن امام الفيل كانه حية تسعى اونسمة ريح عاصف ولكن خـرطـوم الـفيـل اصـاب برأسه فهوت عمامة الرجل ولكنه نجى والطفل معه– وتـوجـه الرجل مسرعاً نحو المرأة المنبوذة حتى وافاها وقدم اليها طفلها وقال خذيهِ وقريعيناً.

فابتهجت المرأة واخذت تقبل طفلها وتدعوللرجل الرحيم. اذ اقبل رجل آخـر وهـو مـلتف ببـردـة فـكشف عـن وجهـه ويديه اذا فى يمينه خنجر فرمى الـخـنـجـر وقـال ايهـا الـمـلـک الشجاع المقدام كنت آليت ان افتک بک وكـنـت افتـقـدک مـنـذ زمـان وانتـظر الوقت حتى رائيتک تقطف الطفل من مـخـالب الموت. وعرفتک حينما طارت عمامتک وتجلّٰى آثار الجروح فى رأسک ولـكـنـى بـعد الآن لا اقدر ان افتک برجل كريم صاحب قلب حنون رحيم. فاقبض على وأمر بقتلى جزاءً سوء نيتى بک.

فتبسـم صـاحب الجلالة الملک بابر وقال لا اظلم على احد ولا آمر بالقتل جزاءً على سوء النيات. فانى عفوت عنک وآمر لک بوظيفة فى عسكرى.

هـكـذا كـان شـان الـمـلـوک فـكـانوا شجعانا مقداما ذوى باس وبطش وفى جـنوبهم قلوب مملوء ة رحمة وحنان كانوا يفتشون عن احوال الشعب ويشاهدون العامة من بينهم ثم يحكمون ويجيزون.



تذكار الوداد

(مدينة حيدر آباد)

سمعت ان زائرين متعابين نزلا بالهند ومرّا بمدينة آكره فلما دخلا حديقة "تاج" دهشا من منظرها وقالت جميبة لصاحبها وحبيبها "لوانى أتيقن انک تبنى على مرقدى بناية كالتاج لمت فى الحال بكل سرور".

انما هذا كلام لاريب فيه. فان فى تذكارالحب حيات فوق الحيات لاموت لها الى الابد.

بلاد الشرق تمتاز بعواطف الحب والغرام والوفاء والاخلاص فليس "التاج" وحيداً الا ترى الى نجد تحكى تلالها وبقاعها "بقيس وليلى" والٰى "بے ستون" فان آثار الديار تحدثک "بشيرين وفرهاد" والى منازل اخرى تذكر بفلان وفلانة.

والبلاد الهندية معمورة بالحب والغرام. منها ماتشاهد آثارها ومنها ماتسمع حديثها وقلبک يخفق اعجابا بهم وترفع قبعتک احتراما لهم.

وها أنا انقل رواية عن افواه الرجال تشبه رواية تاريخية وهى رواية غرامية تحكى عن اخلاص و وفاء بين متحابين صدق عليها الشعر

نظرة فابتسامة فسلام   فكلام فموعد فلقاء

عشقاً و وافقهما الاقدار فعاشا فى ظل الحب وتركا آثار ودادهما فى حيدرآباد وهى ايضا منها.

لـمـا انـقـرضـت الدولة البهمنية تولدت منها دول صغرى. فكل ولاية صارت دولة مستقلة – فدولة "كولكنده" عبارة عن حصن حصين فوق الجبل وقرى وامصار حوله. فكان الحصن عاصمة الدولة ومستقر سلطانها. وما كانت هذه المدينة الكبيرة الـمـعمورة اعنى حيدر آباد الاالحقول والمرعى للدواب اوالغابات تسكنها الوحوش فـى الاكثـر وينزل الملك والامراء اليها للصيد والقنض وتنزه على شط النهر "موسىٰ" ويعودون الى الحصن ويعيشون فى قصورهم فى ارغد عيش.

كـانـت عـلى شط النهر "موسى" قرية صغيرة تسمى جـجلم– تشمل على اكـواخ اكثـرها من اوراق الاشجار واغصانها. يقيمون فيها اناس من الهنادك اكثـرهـم الـفقراء ليس لهم نصيب من الثروة والغنى فكانوا يعيشون فى عسرو كـانـت نسـاؤهـم راقـصـات مـغنيات. ياتون اليهن الرجال ذوى الجاه والثروة ويـلهـون ويتـفـرجـون بهـن. فكان الرقص والغنا معيشتهن. والذين لهم معيشة كهذه المعيشة لاتكون لهم منزلة عند ذوى الاسباب والجاه ولكن عين الحب لا يلتفت الا الى ماتشتهيه الا نفس والمحبون ينظرون بغير ابصار العقلاء.

كـانـت فـى هـذه الـقـرية (جـجـلم) راقصة فتانة ذات جمال وكمال اسمها "بهـاک متـى". خـرج الاميـر مـحـمد قلى ذات يوم للصيد كعادة الامراء. فلما عبـرالـنهـر "مـوسـى" قاصدا الغابة اذبفتاة ذات جمال مدهش ودلال راجعة الى كـوخها. تحمل على راسها جرةً مملوءةً من الماء وتمشى على استحياء تتها لک فـى مشيهـا. فلما دنت من مركبه نظرا كلاهما الى الآخرو سهم العشق سبق نظرهما. فـنـزل الامير من فرسه ومشى خلفها الىٰ كوخها معجبا بجمالها مزهولا غائباً عن صـوابـه. حتـى دخـلـت الـكـوخ واكرمت بالامير فازداد عجبه من ادبها وحسن كلامها ورجع الامير الصياد الى قصره فى الحصن وقد صيد قلبه.

اخـذ الاميـر مـحـمد قلى ينزل من حصنه كل يوم كانه يقصد الغابة للصيد

ولكنه بعد ذلك اليوم ماكان يعبر النهر الا ليزورها ويجلس معها ويفرج نفسها بحديثها وغنائها. فتعلق روح كل منهما وتحابا ووقعا فى شرك العشق لاانفصام لها وتعاقدا ان لا يفوتهما يوم بغير لقائهما.

فذات يوم كان الامير يريد النزول الى "ججلم" اذا مطر السماء واشتد المطر حتى المساء. فلما غربت الشمس اضطرب الامير اشد الاضطراب لانه قضى يومه بغير لقاء "بهاگ متى" فخرج من الحصن على فرسه قاصدا قرية "ججلم" والليل دهماء والسحاب ماطر.

فلما وصل على الشط وقف جواده ولم يتقدم نحو الامام لان النهر كان هائجاً ولا يسمح احداً للعبور. فنظر الامير نحو القرية فلمح على شط آخر نوراً ينبعث من السراج فايقن ان حبيبته الوفية يقظانة وانها انارت السراج ليهدى اليه ضالها الذى لم ينجز بوعده وتاخر عن الزيارة حتى سبقه الليل. فركض جواده والقاه فى الامواج المتراكمة وعبر النهر ولم يفزعه خطر الموت غريقا.

اخبر الجواسيس الملك ان الامير ولى عهده خرج من الحصن فى مثل هذا الفضاء وعبر النهر وهو هائج وذهب الى ججلم زائراً فتاة رقاصة فاجرة. غضب الملك ولكنه امسك بغضبه وامر المهندسين ان يبنى جسر على النهر ليسهل العبور لمن يمر لاسيما اذا كان النهر هائجا. فهذا الجسر "پران پل" اى "الجسر العتيق" اول بناء شيدوه خارج الحصن وايضا اول شاهد على عشق الامير "محمد قلى" والراقصة الفتانة "بهاگ متى".

ولما رجع الامير الى الحصن وحضر بين يدى ابيه الملك ضجره الملك وامره ان لا يزور فتاة فاجرة هلوكا عاهرة ولكن سلطان العشق امره بغير ما امره ابوه الملك فجمع بين الامرين واخذ يدعوها فى قصره على حين غفلة من ابيه. حتى وافقه الاقدار ومات ابوه وخلفه من بعده.

صـار الاميـر ملكا وجلس على عرش الدولة ولكنه مانسى ذلک الوداد و تـلک الـوعود فطلبها فی قصره الملکی الجديد ليجعلها ملکة فاقترحت عليه ان يبنی تذکاراً لعشقهما. فامرالسلطان محمد قلی ملک "گولکنڈه" ان تعمر مـدينة جديدة علی شط النهر "موسیٰ" وسمی المدينة "بهاک نگر" نسبة الی عشيقته الوفية.

بـنيـت الـقـصـور والـمـنـازل ورفـع الحصار حول المدينة وعمرت المدينة فـجـعـلها عاصمة الدوله وبنی فی وسط المدينة بناية مربعة الشکل فی کل رکن مـنها منارة عالية. وتفننوا فی بنائها وشيدواها بالجص والآجر وسمی البناية "چار مينار" ای "المنارات الاربعة"

يـقـال ان هـذه البـنـاية المربعة ذات منارات اربعة عالية بنيت بمکان کان کـوخ "بهـاگ متـی" فيـه. وعلی سقف البناية معابد. ففی الشرق منها مسجد وفی الرکن الشرقی الجنوبی معبد للهنادک الوثنيين. کان البناء اشار بهذا الی المتحابين المتقلدين جديتين مختلفين.

"بهـاگ متـی" اسلمت بعد ماصارت ملکة ولقبها الملک محمد قلی ب "حيـدر مـحـل" فتـغيـر اسـم الـمدينة مع من انتسبت اليها. فان "بهاگ متی" لـقبـت حيـدر مـحـل و مـديـنة بهـاگ نـگـر اشتهـرت بحيدرآباد. فليقال ان حيدرآباد هی فی الحقيقة تذکارالوداد.



الرثاء فی الأردویة

يـمتـاز الانسان بين ابناء جنسه بل في المخلوقات كلها بعوا طفه التى هذبته وأسسـت الـمـدنية والـحـضارة. لولا ها لما عمرت الارض ولا ارتقت الحياة وبـقيـت شـعاباوغابات تسكنها الوحوش الضارية ولو كان الامر كما كان قبل استيـلاء الانسـان عـلـى الارض لما وجدت فيها الا جثثا رامدةً ولكنه لما هبط آدم وكثـر ولـده الـذيـن كـانـو يـميـلـون بـعضهم إلٰى بعض ويعيشون حيـات اجتـمـاعية فـقـد نـمـى شـجـر الحياة ومد ظله على العالم كله فعمرت الارض وصارت مدنا وامصارا يسكنها ذو قلب حنون.

فـاذا ثبـت ان الانسـان هـو الـذى عـمـر الارض وارفـع الحياة الى منزلتها الـعـلياء فيلزم انه ماتيسر له هذ الفوز المبين الا بتقليده الحياة الاجتماعية التى دعـت اليهـا عـواطـفـه الـميـالة الـى مثـلـه فى الانسانية ولذلک يقال ان اصل الانسان الانس وبه صارالحيوان الماشى على قدميه انسانا.

انـنـا اذا امـعـنـا الـنـظـرفـى الانسان نفسه لوجدناه اقوى على كل صحب يحتمله ويستقبل الامورالهامة عالى الهمة ضابطاً مجتهدا وضاح الجبين باسما فـى كل حال ولكن ينفد صبره متى ما فجع بفقد انيسه. فياء ن ويبكى وينتحب ويسيل من مقلته سيل العبرات كأنه بحرمواج لا يسده شیء.

انـما هو مضطر على البكاء فى ذلک الحين. الا ترى اصبر الصابرين وهو خـاتـم الـنبيـن ﷺ وعلى اله وصحبه اجمعين لما مات ولده فابتلت لحيته من

الـدمـو ع الـمنحدرة المتساكبته وهو يقول "عين تدمع والقلب صابر على قضاء الله وبلاء ه" فان بكاء المفجع اذا كان ضد الصبر لما ابتلت لحيته.

إن الانسـان إذا مـافـجـع يـضطر الى البكاء والانين. فالوجع الممتلى قلب المضطر اذا تجاوز اللسان والدموع اذا ما انتظمت فى سلسلة مترنمة والانين لبـس حـلية الالـفـاظ فهو الشعر الرثائى. يظهر تاثر الفجيع وعطفه على الفقيد ولحنه الحنون يمثل تجاوب اظار على ربع ردى.

والشـعـر الـرثـائـى يـوجد فى كل ادب من الآداب لانه ماوجد فى المجتمع الانسانى فرد واحد لاياتيه الاجل ولا يموت ويعيش ابوالدهر فيرتحل كل انسان متى يوافيه اجله ويترک الدنيا وما فيها من بيت ومال وانيس قريب لا يلتفت الى شـئ مـنهـا. فـلا يستـوقفه بكاء الباكيات ولا عويل الفجيع. وكل من يعيش على الارض مـصـاب بـمـوت اخيه وبنه وابيه. فيحس بالم شديد يوذيه ويضطرب فى عمره الطويل ويضطر الى بكاء وعويل فيتاء وه والدموع من عينيه تسيل.

الادب العربى من اغنى اللغات فى الرثاء والتابين. لان العرب كانوا احوج الـنـاس الٰى بعضهم. فكان كل واحد منهم كيد تحمى عن الجسد كله. فكانوا كسـلسـلة اذا انـفک مـنهـا حـلـقة نـقـصـت السـلسلة وانتشرت الحلقـات الـمتكسرة فتان كل منها. فالمصاب باخيه ان ابنه اوباحد من الاقرباء كان يفجع شـديدا اويحسب حياته اصعب بعد الذى ارتحل فيضطرب ويتاوه ويأن ويرثى فـقيـده كـل حيـن فـكثـرت المراثى وعدت من ارقى اصناف الشعرا العربى لا يعادله فى كثرة العدد الا الشعر الحاسى.

اذا طـالعت المختارات من الشعر الماثور شاهدت انه لايوجد شاعرالا هو يرثى ولو ما كان من الاخصاييين فى الرثاء كبعضهم تراسهم تماضر فانها بذلت قـريـحتهـا فـى رثـاء اخـويـه. فيـنـدر بيـن الشـعراء من لا يفوه بشعر رثائى قط

ولشغفهم فی هذا الباب قد اهتموا بوضع العيار للمرثية كما وضع اعياراً لسائر اصناف الادب ليظهر الغث من الثمين ويمتاز الجيد من الفاسد.

فيجب على الشاعر ان لا يبالغ فی الوصف. لان المبالغة عيب لاسيما فی الرثاء فلا يسب التحسرو البكاء الٰی غير من يكون اهلا بذلک. فبكاء الدواب او الجماد كالبيت والسيف مستحيد فاذا يحكی الشاعر عن هولاء انها تبكی لا يصدقه السامع فيفوت غرض الرثاء ومن يريد عيار الرثاء مفصلا فيراجع مطولات الفن.

وما عدا تلک المحاسن والاضداد التی بينوا ها علماء النقدالادبی انی وفقت بعيارين آخرين. فالاول منهما انه يجب ان تكون بين المفجع والفقيد نسبة قريبة لان الالم المحضی علی الرثاء لا يمكن وجوده لغير قريب قط فالرثاء بدون جرح فی اعماق القلب حكاية عن غير الحقيقة. والاخر ان لا يمر الزمان على الفجيعة فيحول بينها وبين المرثية لان مرور الايام تداوی الكلوم و تنقص فی شدة الألم.

لقد انكشف على هذا الامر حينما كنت اطالع ديوان الخنساء وترجمتها فلما قرأت انها لقيت امير المؤمنين عمر الفاروق رضی اللّٰه عنه فنهاها عن الرثاء فقالت له او كنت انت المصاب لما قلت ما قلت. فادركت انها صدقا. عدم النسبة القريبة بين صخروبين الفاروق اعجبه وتلک النسبة بينه وبين اخته تماضر حضتها على الرثاء فحصل لی العيار الاول.

ولما قرأت انه قيل لها. اترثين وقد اسلمت وهجرت الجاهلية الاولیٰ فقالت كنت ابكی له من الثأرو انا اليوم ابكی له من النار فادركت من السوال والجواب عنه ان مرور الليالی والايام ينقص ويضعف الآ لام. فاخذت هذا الامر ايضا كعيار لنقد المرثية.

الاردوية مـن اغـنـى اللغات الهندية اد با، مخزائن الكتب مملوء ة من الكتب القيمة فى النشر والشعر باصنافهما. وهذا الادب يفوق الآداب لا فى عدده فقط بل فى رقة المعانى وبداعة الاسلوب لا يعادله ادب من الآداب فى اى لغة هندية.

مـاتيسر لنا ان نعلم كيف كان هذا الادب فى بدء ه لان الكتب القديمة قد غـابـت عـن الانـظـار وضـاعـت حتـى لا نـعلم شيئًا ولا اسماء ها تماما. ولكن المكتشفين اكتشفوا ببعض الكتب التى صنفت وكتبت فى الولاية الدكنية اى الجنوبية فانها اقدم الكتب عثرنا عليها.

تلك الكتب القديمة ترنيان ان الادب كان رائقاً فى عصره القديم وشعرا ء الـعـصـر الغابر كانو ينظمون الاشعار فى كل صنف من اصناف الشعر. فنجد فيهـا الـقـصـيـدة والرباعى والمثنوى والغزل والمرثية وغيرها وكلها مدخرفى دواوين الشعراء.

انتشـرت الاردوية فى انحاء البلاد وصفت ادابها فتعددت الاساليب وابدع الشـعـراء وتفننوا فى القوالب وبضهم اختصوا نفوسهم بصنف من اصناف الشعر واشتهروا به. كشاعر القصيدة اوشاعر الرباعى اوشاعر المرثية وغيرها.

نجدالمراثى كثيرة فى هذا الادب ولكن اكثر الناس لا يعرفون باسم المرثية الا الهـاشـميات. لان اكثر الشعراء ما يرثون الا حسينا ورفقاء ه المظلومين فظنوا انها مـخـتـصـة بهـم. ويـنـدر بيـن الشعراء من يرثى احداً غيرهم. وذلك لانهم يـعـتـقـدون انهم اذا تباكوا على الذين قتلوا ظلما فيغفر الله لهم ذنوبهم ما تقدم منها وما تاخر ويعطى لهم اجر عظيم.

ان الـذيـن اختصوا نفوسهم بالمرثية جعلوها مسدسيته القالب وتفننوا فيها فنجد فيها الشعرا الربيعى الرقيق العذب وكثيرا ما يبدؤن به ويسمونه "چهره" اى اتوجه وذلك بمنزلة التشبيب من القصيدة.

قال ارثى الشعراء الهنود فى مرثية هى تعد من حسن راثية وهو مير ببر على الشهير بانيس. لقد اتفق الناقدون على تقدمه فى هذاالباب.

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح — گلزار شب خزاں ہوا آئی بہار صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثار صبح — سرگرم ذکر حق ہوئے طاعت گذار صبح

تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

"احمر الافق الشرقى حينما ازهرت حديقة الصباح يلبست واصفرت روضة الليل واقبل ربيع النهار وجعل السماء تفدى بالنجوم على الفجر الطالع والعابدون توجهوا الى ذكر الله سبحانه وتعالٰى كانت الشمس الطالعة على السماء المخضرة كانهازهر ورد يبسم فى الحديقة".

فمثل هذه الاشعار كلها بديعة عذبة ولكنها اشعار ربيعية وياتون بعد الوجه "بالرزم" اى المقاتلة وهذه الاشعار الرزمية تختلف من اشعار حماسية عربية لان الشعراء الهنود يذكرون فيها الآلات الحربية كالسيف والرمح والقوس وغيرها ويصفو نها وصفا بالغا بده عن الحما سة والفروسية. كما قال الشاعر فى هذا المعنى.

نیزہ ہلا کے جانب قاسم بڑھا وہ یل — دولہا نے مسکرا کے صدا دی سنبھل سنبھل
گھوڑا نہ گر پڑے ترے لنگر سے منہ کے بل — تو ہے فرس پہ اور تری گردن پہ ہے اجل

ضیغم ہیں بیشۂ اسد ذوالجلال کے
کیجو سناں کے وار ذرا دیکھ بھال کے

البطل القوى هز رمحه وتقدم نحو قاسم بن حسن بن على رضى الله عنهم فناداه العريس (اى القاسم يزعمون انه تزوج مع بنت عمه ليلة قبل المصاف لذلك يلقبونه "دولها" العريس) مبتسما وقال اعتدل واحذر ان لا يقع

فرسک علی الارض لعدم تقویمک علیه. انما انت راکب علی الفرس واجلک علی عنقک نحن اشبال اسد اللّٰه ذی الجلال قاطعن بالحذر التام.

وبعد الرزم یرثون ویتظاهرون بالبکاء والعویل ویسمون هذا الدور من المرثیة "بین" ای البکاء والعویل ولکنها فی الاکثر تخلو عن التأبین والتحسر لان الشعراء لا یتبعون القوانین الادبیة وما یحکون الاکما یشاؤون لیس کما هو فیخلو شعرهم من تأثیر الکلام لذلک یضطرون الیٰ تصریح القول "مومنین مقام گریہ ہے" ای ایها المومنون هذا المقام یلیق ان تبکو فیصرخون السالعون و یتظاهرون بالبکاء وعیونهم لا تسغی ولا بدمعة.

فاذا امعنا النظر فی هذا الصنف من ادب اردویة نجده کثیر العدد بدیع الاسلوب لطیف التعبیر احسن التشبیهات جید الوصف ولکن مع کل تلک المحاسن نجده خالیا عن التحسرعاریا عن التاثیر لان الشعراء ما نظموا تلک الاشعار رثاء القریب لهم وانما یتبرکون بالمرثیة ویرجون ثوابها.

وما عدا هذا الضعف ای عدم التاثیر نجد المراثی مملوء ة بالاکاذیب والاباطیل فلا یمکن لذی معرفة ان رجلا من الاعراب فضلا عن رجال قریش والهواشم منهم کان یعیش کما یصفو نه الشعراء الهنود فاذا نظرنا الی تلک الا سقام والعیوب فلا بدلنا ان نقول ان الشعر الرثائی لا یوجد فی الاردویة الا الاقل من القلیل فانها شمیات من المراثی لا یمکن ان تعد فی المراثی فهل بقی بعدها شی لان الشائع عندنا باسم المرثیة لیس غیرها.

قدیوجد فی هذا الادب الشعرالرثائی بدون اسم المرثیة تظهر فیه شدة الوجع والتحسر بتمامه فمنها ما انشد الشاعر الهندی الکبیر مرزا اسد اللّٰه خان الشهیر بغالب علی فجیعة نزلت به. کان الفقید المدعو بعارف شابا ادیبا شاعرا لطیفا وهو ابن اخت لزوجه وما کان غالب رزق بولد فتبناه هو وزوجه و

ربیاه مثل الولد اذ وا فاه اجله فمات وترک بعده خالته وزوجها (غالب) و اولادا صغاراً ففجعوا کلهم واضطربوا فرثاه غالب:

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور　　　تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

کان یجب علیک ان تنتظرنی یوما او ایاما لماذا ارتحلت وحیدا متنکرا فعش منفردا یوما او ایاماً.

اظن هذا الشعر واخوانه اثمن من مجلدات ضخمة نجدها وافرة العدد من المراثی فی خزائن الکتب عندنا واتیقن ان تلک الاشعار مرثیة مولمة مع انها لیست فی قالب معلوم للمراثی عند ارباب الادب.

وفی الختام انقل بیت آخر للمرحوم استاذی المفتی لطف تغمده اللّٰه برحمته انشده رثاء علی فقید کان هو صدیقه وابن صدیق له اعنی عبد الماجد القادری البدایونی فانه مات غریب عن الواطن وما کان تجاوز عن اربعین اوکاد وکان خطیبا مسقتعا و شاعراً مجیداً فبکی استاذی المرحوم لانه کان فقد المرحوم عبدالقیوم ابا عبدالماجد من قبل وکان صدیقه الوفی فبعده رضی بالابن بده عن الاب ولکن هذا الحبیب اللبیب هجره واتصل بابیه الشهید رحمهما اللّٰه فانشد

جانے کو تو جاتا ہے جو آیا ہے عدم سے
افسوس تو اس کا ہے یہ پہلے گئے ہم سے

ان الذی قدم من العدم فانه یذهب من الدنیا ولکنی متاسف علی انه ذهب قبل ذهابی.

وامثال هذین البیتین نادرة ولکن النادر القلیل یکون ثمینا بل اثمن وفی الزوایا خبایا.



بسلسلۂ جشن زریں مطبوعات تاج الفحول اکیڈمی

نمبر	کتاب	مصنف
۱	**احقاق حق**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۲	**عقیدۂ شفاعت**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۳	**اختلافی مسائل پر تاریخی فتویٰ**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۴	**اکمال فی بحث شد الرحال**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۵	**فصل الخطاب**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۶	**حرز معظم**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۷	**مولود منظوم مع انتخاب نعت ومناقب**	سیدنا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
۸	**عظمت غوث اعظم**	علامہ محبّ احمد قادری بدایونی
۹	**سنت مصافحہ**	تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
۱۰	**الکلام السدید**	تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
۱۱	**رد روافض**	تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر قادری بدایونی
۱۲	**تذکرۂ فضل رسول**	مولانا انوار الحق عثمانی بدایونی
۱۳	**مردے سنتے ہیں**	مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی
۱۴	**مضامین شہید**	مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی
۱۵	**ملت اسلامیہ کا ماضی حال مستقبل**	مولانا عبدالقیوم شہید قادری بدایونی
۱۶	**عرس کی شرعی حیثیت**	مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
۱۷	**فلاح دارین**	مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
۱۸	**خطبات صدارت**	عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی
۱۹	**مثنوی غوثیہ**	عاشق الرسول مولانا عبدالقدیر قادری بدایونی
۲۰	**عقائد اہل سنت**	مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی
۲۱	**دعوت عمل**	مولانا محمد عبدالحامد قادری بدایونی
۲۲	**نگارشات محب احمد**	علامہ محبّ احمد قادری بدایونی
۲۳	**تحقیق وتفہیم**	مولانا اسید الحق قادری
۲۴	**شارحۃ الصدور**	مفتی حبیب الرحمٰن قادری بدایونی
۲۵	**الدرر السنیۃ** ترجمہ از :	مفتی حبیب الرحمٰن قادری بدایونی

۲٦	**احکام قبور**	مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی
۲۷	**ریاض القرأت**	مفتی محمد ابراہیم قادری بدایونی
۲۸	**تذکار محبوب** (تذکرۂ عاشق الرسول)	مولانا عبدالرحیم قادری بدایونی
۲۹	**مختصر سیرت خیر البشر**	مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی
۳۰	**احوال ومقامات**	مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی
۳۱	**خمیازۂ حیات**	مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی
۳۲	**باقیات ہادی**	مولانا محمد عبدالہادی القادری بدایونی
۳۳	**مدینے میں** (مجموعۂ کلام)	حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری بدایونی
۳۴	**مفتی لطف بدایونی**	مولانا اسیدالحق قادری
۳۵	**مولانا فیض احمد بدایونی**	پروفیسر محمد ایوب قادری
۳٦	**قرآن کریم کی سائنسی تفسیر** (ایک تنقیدی مطالعہ)	مولانا اسیدالحق قادری
۳۷	**حدیث افتراق امت** تحقیقی مطالعہ کی روشنی میں	مولانا اسیدالحق قادری
۳۸	**احادیث قدسیہ**	مولانا اسیدالحق قادری
۳۹	**تذکرۂ ماجد**	مولانا اسیدالحق قادری
۴۰	**عقیدۂ شفاعت** (ہندی)	سیدنا شاہ فضل رسول قادری
۴۱	**فلاح دارین** (ہندی)	مولانا عبدالماجد قادری بدایونی
۴۲	**دعوتِ عمل** (ہندی)	مولانا عبدالحامد قادری بدایونی
۴۳	**عقائد اہل سنت** (ہندی)	مولانا عبدالحامد قادری بدایونی
۴۴	**معراجِ تخیل** (ہندی)	حضرت شیخ عبدالحمید محمد سالم قادری بدایونی
۴۵	**مولانا فیض احمد بدایونی** (ہندی)	محمد تنویر خان قادری بدایونی
۴٦	**پیغمبرِ اسلام کا مہان ویکتتو** (ہندی)	محمد تنویر خان قادری بدایونی
۴۷	**احادیث قدسیہ** (ہندی)	مولانا اسیدالحق قادری
۴۸	**عقیدۂ شفاعت** (گجراتی)	سیدنا شاہ فضل رسول قادری
۴۹	**Call to Action**	Maulana Abdul hamed qadri
۵۰	**100,Hadith Qudsi**	Maulana Usaid ul Haq Qadri

